بسم الله الرحمن الرحيم

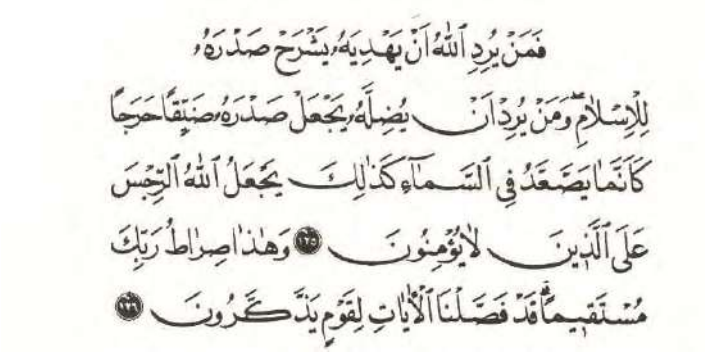

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ
لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ
عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس جب اللہ کسی کو ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے جیسے کہ وہ زبردستی آسمان پر چڑھ رہا ہے (اس کی طرف اونچا ہو رہا ہے) اسی طرح اللہ ان لوگوں پر کثافت مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے آیتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵، ۱۲۶)

اسلامی علوم و معارف اور علمی و ثقافتی افکار و عقائد کا ترجمان

شمارہ: ۲۵۳ / خصوصی شمارہ (۱۴۴۳ھ)

اسلامی تمدن

ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون: ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
ichdelhi@gmail.com
http://newdelhi.icro.ir

مشاورین علمی

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر سید علی محمد نقوی، پروفیسر سید طیب رضا نقوی

ادارتی بورڈ

پروفیسر سید اختر مہدی رضوی ، ڈاکٹر حیدر رضا ضابط، ڈاکٹر علی رضا قزوہ

چیف ایڈیٹر	:	ڈاکٹر محمد علی ربانی
ایڈیٹر	:	پروفیسر سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی
جوائنٹ ایڈیٹر	:	حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید غلام حسین رضوی
ناظر اشاعت	:	حارث منصور
پریس	:	الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی۔

ISSN: 2349 – 0950

صرف غیر مطبوعہ مقالہ ہی ارسال فرمائیں۔

اگر ممکن ہو تو مقالہ، بذریعہ ای میل ichdelhi@gmail.com ارسال فرمائیں۔

مقالہ، ایران کلچر ہاؤس کے پتہ پر پوسٹ بھی کر سکتے ہیں۔

مقالہ کی اشاعت کے لئے ادارتی بورڈ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

مقالہ نگار افراد کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست مضامین

اداریہ		۱
قرآنی۔مذہبی تعلیمات اور جدید شہر اسلامی تمدن کا خواب	گروہ مؤلفین: احمد عباسی دربیدی، نسرین بیگ زادہ مترجم: مولانا محمد ذہین	۳
جدید اسلامی تمدن میں اسلامی روحانی صحت کا مقام	گروہ مؤلفین: ڈاکٹر سید حسن مقدم نیا، ڈاکٹر محمد علی محققی و امیر حسین علی محمدیان مترجم: مولانا سید محمد جعفر زیدی	۲۱
جدید اخلاقی تمدن، فقہ سیاسی کی بالیدگی کا مرکز	گروہ مؤلفین: سید علی پور منوچہری، محمد رضا فارسیان مترجم: سید اطہر عباس رضوی	۲۷
تمدن ساز یونیورسٹی نصاب کی شناخت	گروہ مؤلفین: حسن نجفی، ڈاکٹر مہدی سبحانی نژاد مترجم: سید محمد جون عابدی	۵۱
اسلامی تمدن، تصور، خصوصیات اور تقاضے	مؤلف: قنبر علی صدی مترجم: ڈاکٹر خان محمد صادق جونپوری	۶۹
بین الاقوامی قانون میں اسلامی۔انسانی حقوق کی معیاری قبولیت	گروہ مؤلفین: سیامک کرم زادہ، مسعود علیزادہ مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری	۷۷
بین الاقوامی علمی تعلقات کا فروغ اور اسلامی تمدن کا مستقبل	مؤلف: محمد حسینی مقدم مترجم: مولانا سید حمید الحسن زیدی	۱۰۱

اداریہ

اسلامی تمدن ایک ایسا تمدن ہے جس کے تمام اجزا دین اسلام پر مبنی ہیں۔ اس کی مفہومی اور موضوعی وسعت، دین اسلام کی الٰہی آفاقیت کی آئینہ دار ہے۔ مجموعی طور سے اسلامی تمدن ان تمام مادی اور روحانی ظرفیتوں سے عبارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی سعادت و سربلندی کے لئے اس دنیا کے فطری نظام اور خود اس کے اپنے وجود میں رکھی ہیں۔ اسلامی تمدن کے جو خصوصیات اسلامی مفکرین اور مورخین نے تاریخ اسلام میں بیان کئے ہیں ان میں قرآنی قوانین کی مرکزیت، عقل، علم، اخلاقیات، خدا کے لیے جدوجہد، انسان دوست حکمرانی، امانتوں سے پرہیز، عوامی فلاح و بہبود، عدل و انصاف کا قیام، سود پر مبنی اقتصادیات سے پرہیز قابل ذکر ہیں۔ "جدید اسلامی تمدن، اسلامی تعلیمات کے مطابق مادی اور روحانی شعبوں میں انسانی فضیلتوں کے مظاہر، علامتیں اور کامیابیاں ہیں جنہیں تمام شعبوں میں اسلام کی ترویج کے لئے بروئے کار لایا جائے۔ لہٰذا، موجودہ حالات میں جدید اسلامی تمدن کے تصور سے جو بات سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جدید اسلامی تمدن، اسلامی معاشروں کی یکجہتی اور اسکے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک طریقہ اور نظریہ تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ یعنی ایک ایسی قوم تک جس کی سرگرمیاں تمام شعبوں میں اسلامی معاشروں کی ترقی اور خوشحالی اور اسلامی دنیا کے مزید اعتبار کا سبب بنے، جدید ذرائع ابلاغ، فن، سنیما، بین الاقوامی تعلقات میں بہتری اور اپنے نظریات و تعلیمات کو عام کرنا، اسلامی تہذیب کو متحرک رکھنے اور جدید مغربی دنیا کے مقابلے میں رہنے کے لئے نئی انسانی ضروریات کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے۔ جدید اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ کے لیے اجتماعی کوشش اور حکمت کی ضرورت ہے جو اتحاد، نظم وضبط، کام، کوشش، خدا پر ایمان، تخلیقی صلاحیت، عقلیت، علمی استعداد اور مضبوط میڈیا کے سائے میں پیدا ہوتی ہے جو کہ ایران کے

اسلامی انقلاب کا حتمی ہدف ہے۔ اگر اسلامی تہذیب کو حاصل کرنا ہے تو یہ ایک منطقی اور مسلسل سلسلہ ہے جو مذہب، عقلیت، علم اور اخلاقیات کے چار ستونوں پر قائم ہے اور اس کے حصول کے لئے پانچ مراحل، اسلامی انقلاب، اسلامی نظام، اسلامی ریاست، اسلامی معاشرہ اور اسلامی تہذیب کو اسکی راہ پر گامزن رکھنا ہوگا۔ اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کی تشکیل کے بعد جن عناصر، اور جہتوں کا آئین میں تصور پیش کیا گیا ہے، ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند اقدام ناگزیر رہے ہیں، اسکولوں کے خدمات؛ یونیورسٹیوں کی طرف سے علمی خدمات جو بالآخر ریاست اور اس کے لائحہ عمل کو مذہبی فریم ورک کے مطابق ڈھالنے کا باعث بنا۔ رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ خامنہ ای اور بعض مفکرین نے اس تصور کی وضاحت کی ہے۔ نیز نئی دنیا میں ایک نئی اسلامی تمدن کی تشکیل پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ زیر نظر جریدہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس سے متعلق مطالب کو پیش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی ربانی

چیف ایڈیٹر

قرآنی۔مذہبی تعلیمات اور جدید، شہر اسلامی تمدن کا خواب

گروہ مؤلفین: احمد عباسی دربیدی[۱]، نسرین بیگزادہ[۲]

مترجم: مولانا محمد ذہین

خلاصہ

جدید شہر اسلامی تہذیب و تمدن کے خواب پر مبنی "مدینہ فاضلہ" تک جلد رسائی کے لئے ایک اہم راستہ قرآن اور دین اسلام کی تعلیمات سے متمسک ہے۔قرآنی تعلیمات کے پیش نظر اور یہ کہ انسانی معاشرے کی سعادت کے لئے قرآن کے پاس بہترین راستے اور طریقے موجود ہیں، یہ سوال پیش آتا ہے کہ ایک جدید شہر اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ، تشکیل دینے کی راہ میں اسلای اور قرآنی تعلیمات کا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ موجودہ تحریر میں معتبر مآخذوں اور اس میدان میں ہونے والی تحقیقات کے نتائج کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور مختلف تہذیبوں کے تقابلی جائزے کے ذریعہ وہ امور جو اس مدینہ فاضلہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں انہیں بیان کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں تمام دینی مآخذوں میں تحقیق اور جستجو سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مدینہ فاضلہ کے تمام امور توحیدی امور کے ساتھ آمیختہ ہوتے ہیں اور اسلامی اور قرآنی تعلیمات نے اس سلسلہ میں بہترین پروگرام اور لائحہ عمل پیش کیا ہے۔اور اس کے مطابق اسلام، مدینہ فاضلہ کی تشکیل پر مکمل توجہ رکھتا ہے اور جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ میں امن وامان، اتحاد وانسجام، روحانیت اور دینداری، اسلامی طرز زندگی۔۔۔ جیسے امور پر توجہ دی جاتی ہے۔

۱۔ گریجوئیٹ، شیعہ شناسی/ معاشرتی علوم، دانشکدہ ادبیات دانشگاہ اصفہان۔

۲۔پی ایچ ڈی واسٹوڈنٹ، انجینئرنگ، دانشگاہ خوارزمی تہران (مؤلف وانچارج: a.abbasi.d2020@gmail.com)

ا۔ مقدمہ اور موضوع کی وضاحت

انسانی زندگی کا مثلث، دین ،ثقافت اور تہذیب سے تشکیل پاتا ہے اور اس کا اصلی ضلع، دین ہوتا ہے؛ کیونکہ کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں صحیح معلومات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کی مذہبی شکل سامنے نہ ہو (حجازی،۵۸: ۱۳۶۰)۔ تو اب وہ دین اور مذہب جس کی بنیاد پر ثقافت اور تہذیب تشکیل پاتی ہے اسے سب سے زیادہ کامل (یعنی دین اسلام) ہونا چاہئے ، جسے خود انسان و جہان کے خالق نے بھیجا ہو، تو بلاشک ایسی ثقافت اور زندگی جو اس عظیم ،برتر اور عالمگیر تہذیب کے ذریعہ وجود میں آئے گی وہ تمام زمانوں، صدیوں اور پروگرام کے لئے کامیابی اور ترقی کا ذریعہ بنے گی۔ دوسری طرف سے دنیا بھر کے متعدد محققین نے عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات میں دین کو ایک مؤثر عنصر جانا ہے اور سیاست کی تعیین میں اسے ایک اہم سبب جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے مغربی مصنفین اور اہل نظر افراد نے موجودہ حالات کے پس منظر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہ پیشین گوئی کی ہے عالمی پیمانہ پر ایک طاقتور حکومت رونما ہونے والی ہے جو دین کی حامی اور اسکے فائدے میں ہوگی۔ یہ افراد ، حقیقت پسند (Realists) افراد کی طرح دین کو صرف خارجہ پالیسی میں ایک آلہ کار کی طرح نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ایک قوم میں اتحاد اور استقلال پیدا کرنے والے عنصر اور بین الاقوامی سیاست کے ثبات کا سبب بھی قرار دیتے ہیں (موسوی،۱۳۹۱: ۱۴۸)

دین اسلام کا ظہور اور قرآن کریم کی ابتدائی آیات تعلیم و تعلم پر مبتنی تھیں، جو اپنے مناسب پروگرام اور لائحہ عمل کے ذریعہ ایک عظیم اور مستقل تہذیب کی تشکیل کا سبب بنی۔ سرزمین عرب میں بہت سی سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیاں اسلام کے ظہور سے پیدا ہوئیں جس نے مسلمانوں خصوصا عربوں کے طرز زندگی کو جو زمانہ جاہلیت کے طریقہ اور جنگ و جدال کے اصولوں پر مبنی تھا، اس طرح تبدیل کر دیا کہ انہیں ایسے عظیم انسانوں سے متصل کیا کہ جنکا رابطہ اس کائنات کے مبدا سے تھے، ان کے سامنے ایسی نئی آئیڈیالوجی اور تعلیمات پیش کی جو حیات بخش تھیں، جن کے نتیجہ میں ایک عظیم عالمگیر اسلامی تہذیب اور ثقافت وجود میں آ گئی (فوزی و صنم زادہ، ۱۳۹۱)۔ جس کی تعلیمات کے سائے میں ہر زمانے میں بہترین اور ترقی یافتہ تہذیب کو تصور کیا جاسکتا ہے اور اس کی بنیاد پر مختلف پہلوؤں سے زندگی کے مختلف میدانوں میں زندگی کی بہترین شکل وصورت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اس تہذیب میں ہمیشہ سے انسانی افکار کی بلندی اور مدینہ فاضلہ کی تشکیل پر توجہ رہی ہے اور یہ امر انسانی تحرک کے لئے سب سے طاقتور محرک کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ یہ تہذیب تمام انسانی مصائب وآلام کو ختم کرکے ان انسانی صلاحیتوں اور لیاقتوں کو شکوفہ کرسکے جس کے ذریعہ ایک سعادتمند کامل معاشرہ وجود میں آسکے (محمدیان مصمم و ضرغامی،۱۳۹۶: ۵۶) یہی وجہ ہے کہ ترقی، توسیع، تہذیب، ایک مطلوب معاشرہ اور مدینہ فاضلہ کا حصول جہاں کے سماجی اقدار بلند و بالا ہوں، تمام سماجی مصلحین اور خیرخواہ افراد کی دیرینہ خواہش رہی ہے۔(سعیدی روشن، ۱۳۹۳: ۶۲)مدینہ فاضلہ یا آرزوؤں کا شہر یا یوٹوپیا ایک ایسا تصور ہے جو ہمیشہ سے انسانی زندگی کے لئے بیان ہوتا رہاہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے تہذیب انسانی میں اس تصور کی طولانی تاریخ رہی ہے۔ تمام اقوام اور تہذیبوں کے درمیان ایک مشترک عنصر یہی مدینہ فاضلہ کی چاہت کا مسئلہ رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس عظیم آرزو تک پہونچنے کے لئے انسان نے بے پناہ سختیاں اور مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ تاریخی بلکہ ادبی کتابوں میں یہ امر بہت زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے؛ جیسے سیمرغ تک پہونچنے کے لئے سیمرغ کی حرکت کی مثال جو ایک طرح سے مدینہ فاضلہ کی طرف اشارہ ہے جسے *عطار* بہت خوش اسلوبی اور خوبصورت انداز میں ایک داستان کی صورت میں بیان کرتا ہے۔(اسفندیاری و ہمکاران، ۱۳۹۵: ۱۰۰) یا دیگر مدینہ فاضلہ کی گفتگو جو فلسفیوں اور مؤرخین کی تحریروں میں ملتی ہے وہ اسی موضوع اور مسئلہ کی اہمیت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے۔

جیساکہ واضح ہے کہ مفکرین، قدیم زمانے سے مدینہ فاضلہ کے موضوع کو بہت اہمیت کے ساتھ بیان کرتے آئے ہیں، یعنی ایک ایسا شہر جس میں مکمل انسانی زندگی کی تمام خصوصیات موجود ہوں۔ اور یہ مفکرین اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق اس شہر آرمانی تک رسائی کے لئے راہیں اور طریقہ کار بھی بتاتے آئے ہیں۔ مادی اور سیکولر ثقافت میں اس مدینہ فاضلہ تک رسائی کے لئے ضروری ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کرے، قدرتی امور اور جانوروں کو اپنے قابو میں کیا جائے، سماجی اقتدار حاصل کیا جائے، کیونکہ سیاسی اور سماجی اقتدار تمام انسانوں کی آسائش اور ان کی آسودگی کے لئے ہے اور اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے اقدار مخالف اور غیر اخلاقی کاموں کو بھی انجام دیا جاسکتا ہے جس کو خلیج فارس کے کنارے پر بسے اندلس کے بعض شہروں، یا یوروپ کے بہت شہروں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جسمیں ان کی تمام کوششیں اور منصوبے خدا سے دوری، حیوانی فطرت سے نزدیکی اور پاکیزہ انسانی سرشت سے دور ہوجانے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی بنیادیں اس بات پر استوار ہیں کہ ایک معاشرہ اسی صورت میں مقبول اور مطلوب ہوسکتا

ہے جب اسمیں توحیدی افکار جلوہ نما ہوں، یہ مدینہ فاضلہ اسی صورت میں محقق ہو سکتا ہے جب اس میں اسلامی اقدار اور عقائد کی رعایت ہو اور یہ اقدار مسلسل ترقی کرتے ہوئے انسانی سعادت کی راہیں ہموار کرتے رہیں اور انسان کو خلقت کے عظیم مقصد سے نزدیک کردیں۔ (سعیدی روشن، ۱۳۹۳: ۶۲) چنانچہ ضروری ہے کہ قرآنی تعلیمات سے تمسک کرتے ہوئے جو انسانی زندگی کے تمام امور کا سرچشمہ ہے، جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کا تعارف کرایا جائے۔ لہٰذا اس تحقیق کا اہم اور اصلی سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی تشکیل میں قرآنی تعلیمات کا کیا کردار اور مقام ہے اور اس بنیاد پر جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی کیا خصوصیات ہونی چاہئے ؟

۲۔اس موضوع پر تحقیق کی اہمیت اور ضرورت

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کے علمی پیشرفت کا اصل سبب دین اسلام اور اس کی تعلیمات تھے (بہنیافر، ۱۳۸۸) قرآن اور اسلامی تعلیمات کی ہمیشہ سے اس بات پر تاکید رہی ہے کہ تمام انسان ترقی کریں اور انسانی ثقافت میں توسیع ہو، اس کے علاوہ اس کی توجہ انسان کی مادی اور روحانی ضرورتوں کی طرف بھی رہی ہے اور ان سب کے پیچھے مقصد ا،سلامی تہذیب اور ثقافت کو تشکیل دینا تھا(کاشفی، ۱۳۸۴: ۵۴) کیونکہ مفکرین کے مطابق تہذیب مختلف عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ ویل ڈورینٹ تشکیل تہذیب کے اسباب کو چار حصوں میں بیان کرتا ہے :

ا۔ تہذیب کے اقتصادی اسباب؛ زراعت، صنعت اور اقتصادی و معاشی مراکز؛ ۲۔ تہذیب کے سیاسی اسباب؛ ملک، حکومت، قانون اور خاندان؛ ۳۔ تہذیب کے اخلاقی اسباب؛ شادی، جنسی اخلاق، سماجی اخلاق، دین اور دینی آداب؛۴۔ عقلی اور روحی اسباب؛علم وادب، فن و ہنر (رحمانی و جعفر آقایی۱۳۹۰: ۱۰۳)۔ تو تہذیب کی تعمیر نو اور مدینہ فاضلہ کاخاکہ کھینچنے کے لئے ضروری ہے کہ مذکورہ اسباب کے سلسلہ میں قرآنی اور دینی دستورات پر غور کیا جائے اور اسکی وضاحت کی جائے۔جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی خصوصیات کو مشخص کیا جائے۔ لہٰذا اس تحریر کی اہمیت و ضرورت کئی زاویوں سے سے قابل وضاحت اور قابل غور ہو جاتی ہے۔ پہلی چیز یہ کہ مدینہ فاضلہ سے کیا مراد ہے ؟اسلامی تہذیب اور جدید اسلامی تہذیب کیا ہیں، دونوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ دوسری چیز یہ کہ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کے سلسلہ میں اسلامی اور قرآنی تعلیمات میں کن نکات اور دستورات کو بیان کیا گیا ہے اور کیا خدائی تعلیمات پر توجہ کے بغیر کامیاب مدینہ

فاضلہ تشکیل پانا ممکن ہے یا نہیں؟

۳۔اس تحقیق کا طریقہ کار

یہ تحریر اور تحقیق تجزیاتی اور توصیفی روش اور طریقہ کے تحت انجام پائی ہے اور عملیاتی ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی مدینہ فاضلہ کی خصوصیات کے سلسلہ میں کتابخانوں اور انٹرنٹ پر موجود معتبر علمی اسناد اور مآخذوں کی تحقیق اور ان کا مطالعہ کیا جائے، پھر انہیں بیان کیا جائے۔ اور دینی اور قرآنی تعلیمات کے مطابق جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی خصوصیات کو بھی بیان کیا جائے کیونکہ قرآنی فرامین اور اس کی اتباع میں دینی تعلیمات، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے سلسلہ میں بہترین نکات کو بیان کرتے ہیں۔

۴۔اصول اور تصورات

۴/۱۔مدینہ فاضلہ

مدینہ فاضلہ (Utopia مغربی زبانوں میں) پہلی بار ۱۵۶۱ میں تھامس مور کے ذریعہ اس عنوان کی کتاب میں بیان ہوا تھا جس میں اس لفظ (Utopia) کا استعمال ایک بے عیب و نقص سے پاک سیاسی نظام کی توصیف میں ہوا تھا، لیکن پھر دھیرے دھیرے مدینہ فاضلہ کی اصطلاح سیاسی اور سماجی مباحث میں بھی استعمال ہونے لگی (ینسن و ڈان، ۱۳۹۶: ۱۳) اور پھر زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بھی شامل ہونے لگی۔یعنی یہ کہ مدینہ فاضلہ ایک ایسا معاشرہ یا حکومت ہے جسمیں رہنے والوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور یہ معاشرہ اور اس کے افراد ہر قسم کی فکر اور خوف سے دور رہتے ہیں، موت کی فکر سے آسودہ خاطر ہو کر اپنے شہر میں رہتے ہوئے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ یوٹوپیا ایک زمینی شہر ہے اس شہر میں اس کے افراد کی جگہ اور مقام معین ہوتی ہے۔ اور وہاں کا انتظام شہری قانون کے تحت ہوتا ہے جسے انسان ہی نے بنایا ہے۔ مدینہ فاضلہ، اس جنت کی طرف بازگشت کا خواب ہے جہاں سے انسان کو نکالا گیا تھا اور اس بہشت کی نسبت زمینی شہر کی طرف دی گئی ہے جو انسانی زندگی میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ (شاہ سنی، ۱۳۷۷: ۳۲)

مدینہ فاضلہ ایک ایسا ذہنی اور خیالی شہر ہے جو واقعیت اور حقیقت کے حصار سے باہر نکل گیا ہے اور ہماری ایسی عمیق آرزوؤں کو شامل ہے جہاں ایسے شہر کا تصور ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ جہاں ذہن میں ہمیشہ سعادت تک پہونچنے کی آرزو ہوتی ہے اور موجودہ حالات سے نکلنے اور اسے تبدیل کرنے کا تصور ہوتا ہے اور زمانہ کی حیرانی و سرگردانی سے باہر نکل کر ایک بہتر مستقبل کی طرف بڑھنے کی آرزو ہوتی ہے۔ (محمدیان مصمم و

ضرغامی، ۱۳۹۶: ۵۷)؛ تاریخ کی رو سے انسانی معاشروں کے تکامل اور انکی ترقی میں مدینہ فاضلہ کا بڑا کردار رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اناتول فرنس کا خیال ہے: "جب مدینہ فاضلہ کی خواہش نہیں تھی تو انسان مختلف ادوار میں فرسودہ اور عریان حالت میں غاروں میں رہا کرتا تھا، لیکن جب کہ مدینہ فاضلہ کی خواہش رکھنے والے پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے شہری زندگی کی صورت ترسیم کی تھی"۔ (برنری، ۱۹۵۰، نقل از محمدیان معصم و ضرغامی، ۱۳۹۶)۔

۴/۲۔ تہذیب (تمدن) اور جدید اسلامی تہذیب

تمدن، لفظ کا مصدر "م دن" ہے جس سے کسی جگہ سکونت اختیار کرنا سمجھ میں آتا ہے اور لفظ "مدینہ" بھی اسی سے نکلا ہے (ابن منظور، ۱۴۱۴، ج ۱۳: ۴۰۲) بعض قرآنی لفظ شناس لفظ "م دن" کو سکونت اور قیام کے معنی میں بیان کرنے کے بعد تمدن (تہذیب) کو اہل مدینہ (شہر) کے اخلاق سے مزین ہونے کے معنی میں جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ لفظ تمدن، مدینہ سے نکلا ہے۔ (مصطفوی، ۱۳۶۰، ج۱۱: ۵۵)

لغوی اعتبار سے تمدن کے معنی، شہر میں رہنا، شہری اخلاق اپنانا، تشدد اور جہالت سے نکل کر شہری زندگی اور آداب سے آشنائی پیدا کرنا اور اسے اختیار کرنا ہے خلاصہ یہ کہ شہری زندگی کا طور طریقہ اپنانا تمدن کہلاتا ہے۔ (مجیر شیبانی۔ ۱۳۷۷)؛ اور اصطلاح میں ایسے اجتماعی اور سماجی نظم و ضبط کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں ثقافتی تخلیقات ممکن ہو جاتی ہیں جو اس چاروں بنیادی رکن اور بنیادی عناصر کو شامل ہوتی ہیں جو اس طرح ہیں:

اقتصادی امور میں احتیاط اور دوراندیشی، سیاسی نظم و ضبط، اخلاقی سنتیں اور راہ معرفت میں کوشش اور فن و ہنر میں توسیع۔ (ویل ڈورانٹ، ۱۳۶۵، ج۱: ۳)۔

جدید اسلامی تمدن چاہتا ہے کہ سنت اور مڈرنٹی کے ارتباط کے ساتھ دین کا احیاء کیا جائے۔ اس رہگذر میں اسلام کی حیثیت ایسے تمدن اور تہذیب کی ہے جو اپنے عظیم نظریات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی میدان میں اپنا بہترین کردار ادا کر سکتا ہے اور بین الاقوامی سطح پر صنعت و حرفت کو تقویت عطا کر سکتا ہے اور اس طرح آرزو اور حقیقت کے امتزاج کے ساتھ بین الاقوامی روابط میں بھی اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور جب انسانی معاشرہ کو دین کا ادراک ہو جائے اور دین کی سمجھ ہو جائے تو اس وقت انفرادی، خانوادگی، سماجی، مقامی، قومی، علاقائی اور بین الاقوامی جیسی سطحوں پر جدید اسلامی تہذیب کا دائرہ فعالیت وسیع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی روابط کے سلسلہ میں دین (اسلام) کا حق ہے کہ منصفانہ اور عادلانہ طور پر اسے پہچنوایا جائے، اور منصفانہ طور

پر اس کی صحیح اور مثبت تصویر پیش کیجائے۔(Reese, 2015) یا یوں کہا جائے کہ جدید اسلامی تہذیب، ایک ایسی تہذیب ہے جسکی بنیاد اسلامی قوانین اور دستورات پر استوار ہے جس میں زمانہ کے تقاضوں اور ضرورتوں پر توجہ ہوتی ہے، اسلامی تہذیب کو آئیڈیل بناتے ہوئے ایک منظّم سماجی زندگی کی نوید دی جاتی ہے جس کے ذریعہ مقام قرب اور سعادت تک پہونچنے کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔

۵۔قرآنی و دینی تعلیمات اور جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ

مدینہ فاضلہ کی فکر اور اسے کس طرح وجود میں لایا جائے، یہ بات کسی نہ کسی طرح تقریباہر مکتب فکر اور مذہب میں پائی جاتی ہے۔ مختلف مکاتب فکر اور مفکرین نے مدینہ فاضلہ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ انکے زمانے کے سیاسی، ثقافتی، اور مذہبی موقف کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ مدینہ فاضلہ کو کبھی ماضی کے زمانوں میں تلاش کرتے تھے اور اسے تاریخ اور کہانی کی زبان میں بیان کیا ہے (عصر زرین)؛اور کبھی پیشن گوئی اور مستقبل میں ٹکنالوجی و آئیڈیالوجی کی تجدید کے طور پر بیان کرتے ہیں۔(آتلانتیس جدید)؛(مبینی، ۱۳۸۶)۔اس درمیان دین اسلام اپنے خاص توحیدی نظریہ اور خصوصیت کے ساتھ ،اپنے مطلوبہ مدینہ فاضلہ کی خصوصیات کو مشخص اور واضح طور پر بیان کرتا ہے (مطلبی و نادری، ۱۳۸۸: ۱۳۱)، اس طرح کہ ماضی، حال اور مستقبل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے مدینہ فاضلہ کی خصوصیات کو ترسیم کرتا ہے۔ اس خصوصیت کے ساتھ کہ انسان کا شہر آرزو اس کی وہی گمشدہ بہشت یا مدینہ فاضلہ ہو سکتا ہے جو جدید اسلامی تہذیب میں نظر آتا ہے اور اسی کے ضمن میں امام زمانہ (عج) کی اس حکومت کی بھی آمادگی ہوتی ہے جو ایک مؤمن کے لئے دنیا میں ایک آسودہ زندگی اور آخرت میں بہشت کو شامل ہوتی ہے۔

اسلامی تہذیب میں شہر، ہر چیز سے پہلے ایمان کا قلعہ ہے اور سیاسی لحاظ سے ایسے قوانین کا تابع ہے جو جس کا سرچشمہ شریعت ہوتی ہے۔اس لحاظ اس شہر کا مذہبی کردار اس کی حکومت کے فوجی اور معاشی اہداف پر ترجیح رکھتا ہے (حبیبی، ۱۳۸۲: ۴۹)، جب کہ موجودہ دور کے شہر اور حکومتوں کا سیاسی، تجارتی اور معاشی کردار دیگر تمام پہلوؤں پر مسلط اور حاوی ہوتا ہے۔یہاں تک کہ دیگر امور ان شہروں میں گمنام ہو کر رہ گئے ہیں۔جدید تہذیب میں شہر جدید، اسلامی تہذیب والے مدینہ فاضلہ کے تصور سے بہت دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کے مطابق مدینہ فاضلہ اس شہر کو کہتے ہیں جس میں اسلامی قواعد و قوانین کی مکمل اور جامع طور پر رعایت ہوتی ہے اور زندگی اسی ارمان کے ساتھ تشکیل پاتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔اسلامی مدینہ فاضلہ کی طرف حرکت ایک منظّم اور منسجم پروگرام چاہتی ہے جس میں سماجی اور معاشی بنیادوں پر توجہ، موجودہ حالت

کو مطلوبہ حالت میں تبدیل کرنے کے لئے ہوتی ہے اور اس میں تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھا جاتا ہے۔ اسلامی مدینہ فاضلہ، انسان کا خدا، معاشرے، ماحول اور خود کے ساتھ رابطہ کیسا ہونا چاہئے اس بات کو ترسیم کرتا ہے۔ ساتھ ہی اقتصادی، سماجی، اور ثقافتی روابط پر توجہ رکھتے ہوئے شہری ڈھانچہ پر بھی توجہ رکھتا ہے اور ایسی روحانی زندگی کو اہمیت دیتا ہے جو مقاصد خلقت کے ساتھ ہماہنگ ہو۔ اور شہر کی ظاہری شکل کے ماوراء اس کی اصل شکل و صورت پر توجہ رکھتا ہے تاکہ اسکی روح اور جوہر تک بھی پہونچا جاسکے۔ (منتظر القائم، ۱۳۸۷: ۸)، اس بات پر بھی توجہ ہونی چاہئے کہ جدید اسلامی تہذیب میں شہر، ایسی جگہ نہیں ہوتا جہاں صرف مذہبی علامتیں مشخص اور آشکار ہوں، بلکہ جدید اسلامی تہذیب کے شہر کی سب واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں نظم و ضبط اور اعتدال برقرار ہوتا ہے اور اس میں اسلامی تعلیمات کے سائے میں ایسا بہترین پروگرام تیار ہوتا ہے جس کے ذریعہ ایک پر امن، رونق سے لبریز خدائی ماحول میں بہترین شہری، تربیت کئے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر شہر، کی شناخت اسلامی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی سب سے اہم اور بنیادی خصوصیتیں دینی اور قرآنی تعلیمات سے حاصل کی جاتی ہیں جنہیں ان امور میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱/۵۔ امن وامان

امن و امان ایک ایسی چیز ہے جس کی ضرورت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں محسوس ہوتی ہے اور عرصہ دراز سے اب تک انسانی زندگی میں مختلف تبدیلیوں کی وجہ رہی ہے۔ کیونکہ یہ ایسا امر ہے جو انسان کی اہم ضرورتوں میں سے ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ حکومتوں اور معاشروں نے ہر زمانے میں امن وامان کی برقراری کے لئے اقدامات کئے ہیں۔ قرآنی لحاظ سے امن وامان اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے اسے ہر چیز پر مقدم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جناب ابراہیم علیہ السلام مکہ میں داخل ہوتے ہیں اور خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے ہیں تو مستقبل میں اس شہر کے ساکنین کے لئے پہلی چیز جو اللہ سے مانگتے ہیں وہ نعمت امن ہے۔ " رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا " (بقرہ، ۱۲۶) پروردگار اس شہر کو امن کا شہر قرار دے دے۔ (آقازادہ ورحمتی ۱۳۹۴)۔ ہر وہ شہر جو نعمت سے سرشار ہوتا ہے قرآن میں اسے آرزوؤں کی زمین سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی مثال دی جاتی ہے۔ سورہ نحل[۱] کی آیت ۱۱۲ کے مطابق "اور اللہ نے اس قریہ کی بھی مثال بیان کی ہے جو محفوظ اور مطمئن تھی

۱۔ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ.....

اور اس کا رزق ہر طرف سے باقاعدہ آرہا تھا" اور امن وامان کو سب سے اہم اور ضروری نعمت کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کے تمام امور میں امن و امان مد نظر ہونا چاہئے۔ موجودہ زمانے کے شہروں میں اگرچہ بعض جگہوں پر تو امن و امان دیکھنے کو ملتا ہے لیکن بہت سی جگہوں، مواقع اور وقت میں خود امان وامان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

امن وامان کا مجموعی تصور یہ ہے کہ یہ امر انسانی معاشرے کی ضرورتوں میں سے ایک ہے اور مدینہ فاضلہ یا آرزوؤں کے شہر کو ہمیشہ جائے امن کے طور پر جانا گیا ہے جہاں کے عوام اجتماعی امن و امان سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ افلاطون اپنی مختلف تحریروں میں ایک ایسے آئیڈیل اور آرزو کے مطابق معاشرے (مدینہ فاضلہ) کی تمنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں لوگ اجتماعی امن وامان سے سرشار ہوں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کہیں پر بھی کسی کو کسی پر تجاوز نہیں کرنے دینا چاہئے کیونکہ تجاوز کی وجہ سے لوگوں میں تزلزل اور انحطاط کی صورت پیدا ہو جائیگی اور امن ومان ختم ہو جائیگا۔

چنانچہ اجتماعی امن وامان اور آسائش کے حصول اور اسکی برقراری کے لئے علم وحکمت کے زیور سے مزین ہونا ضروری ہوتا ہے۔اور بہترین علوم کا سرچشمہ پروردگار کی ذات ہے جو قرآن کریم میں موجود ہے اور اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے پاس ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: "لَيْسَ بَلَدٌ بِأَحَقَّ بِكَ مِنْ بَلَدٍ خَيْرُ الْبِلَادِ مَا حَمَلَكَ" زندگی کے لئے شہروں میں کوئی فرق نہیں، زندگی کے لئے سب سے مناسب شہر وہ ہے جہاں آسائش (امن وآرام) ہو۔ (نوید نیا، ۱۳۸۲)؛ کیونکہ جس شہر میں امن نہ ہو وہاں مختلف سماجی خطرات کو آنے سے روکا نہیں جاسکتا ہے۔لین کہتا ہے: اگر لوگ کسی جگہ کی فضا اور ماحول کو امن وامان نہ ہونے اور خوف کی وجہ سے استعمال نہ کریں، تو وہاں سے عام زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا، (احسانی فرد اور انکے معاونین، ۱۳۹۲: ۳۱۸)؛اور ترقی اور آسایش حاصل نہ ہوسکے گی۔آیات اور روایات میں ملتا ہے کہ امن وامان اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے اور تمام انسانی ضرورتوں پر مقدم اور ان سے پہلے ہے۔ جیسا کہ رہبر انقلاب اسلامی (حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای) امن وامان کو ہوا سے تشبیہ دیتے ہیں کہ ہوا انسان کی ابتدائی ضرورتوں میں سے ہے: "انسان کو ہوا کی طرح مسلسل امن و امان کی ضرورت ہے" (موسوی، ۱۳۹۳: ۱۵۰)۔ خلاصہ کے طور پر کہاجاسکتا ہے کہ قرآن و روایات کی نگاہ میں امن و امان، اہم ضرورت، وطن کی اہمیت کا معیار، اسلام میں تشکیل حکومت کا مقصد اور اہم ترین ذمہ داری اور فرض ہے۔

ایک بے بدیل خدائی نعمت ہے اور ایک اچھے شہر کی خصوصیت میں سے ہے جسے اللہ نے ہر مؤمن سے چاہا ہے۔ (رجوع کریں؛ موسوی، ۱۵۰-۱۳۹۳: ۱۵۳)۔

تو ضروری ہے کہ جدید اسلامی تہذیب کے شہر کے تمام امور میں امن وامان برقرار ہو چاہے وہ معاشی امن ہو یا سماجی اور سیاسی امن۔۔۔

۵/۲۔ اتحاد اور یکجہتی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو مکمل اور جامع ترین دین کے عنوان سے اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اس دین میں اتحاد، یکجہتی ، بھائی چارے اور ہمدلی کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے جیسا کہ اس دین کی عظیم خدائی کتاب قرآن کریم اپنے پیروکاروں اور صدر اسلام کے مسلمانوں کو تعلیم دیتا ہے کہ اختلاف اور تفرقہ سے پرہیز کرو (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳)، ورنہ شکست کھاجاؤگے، (سورہ انفال، آیت ۴۶)، (گیلانی اور معاونین، ۱۳۹۴)؛ مختلف اسلامی فرقوں اور مکاتب فکر میں اتحاد اور مسالمت آمیز زندگی سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے اور ان کا باہم رہنا اور بھائی چارہ کسی مصلحت کی وجہ سے نہیں ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسے ایک دائمی ضرورت کے طور پر دیکھا جائے اور اس کے تحقق کے لئے زیادہ سے زیادہ کوششیں اور جدو جہد کی جائے، (سیاوش اور سلیمانی فر، ۱۳۹۴: ۷۴)؛ چنانچہ جدید اسلامی تہذیب کے شہر کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں اتحاد اور انسجام پایا جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس شہر کی تمام خصوصیات چاہے جسمانی، ہوں یا غیر جسمانی، شہر میں اتحاد، بھائی چارہ اور ہمدلی برقرار کرتی ہیں۔ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ مکمل اتحاد اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس اتحاد اور انسجام کو فرد کی معاشرہ کے اتحاد میں، معاشرے میں ماحول کے ساتھ ، کل میں جزء کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح نظریات میں اتحاد، شہری علامتوں میں اتحاد، پراکندگی میں برابر اتحاد، شہر کے اجزاء کا ایک دوسرے سے مناسب ہونا دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز عوام کا حکام کے ساتھ اور حکام کا عوام کے ساتھ اتحاد، خشنودی خدا کے حصول میں ہم فکری، نظریہ اور عمل میں یگانگی کو۔۔۔ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس شہر کے تمام اجزاء ، وہاں کے باشندوں کے عقائد اور اخلاق ، اسی اتحاد کو تقویت دینے لئے ترتیب دئے گئے ہیں۔ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کے باشندے اگر چاہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہمدلی سے آگے نکل کر اتحاد، نزدیکی اور ہم زبانی یعنی ہم فکری اور ایک آواز کے

مرحلہ تک بھی پہونچ سکتے ہیں، اور یہ امر جتنا زیادہ ہوگا ان کے درمیان اتحاد بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا (جواہر دہی، ۱۳۹۴)۔

اس شہر میں اتحاد اور بھائی چارہ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شہر کا فرد شہر کو گھر شمار کرتا ہے، اور افراد شہر اس میں امن و امان سے بہرہمند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، اور ہم صدا اور ہم زبان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ "یہاں شہر کا مطلب صرف بناوٹ اور ساخت نہیں ہے بلکہ جو لوگ شہر میں رہتے ہیں ان کے آپسی تعلقات بھی ہیں، خود لفظ شہر ایک ایسے معاشرے کی یاد دلاتا ہے جسے متحد، گرمجوش، اور منسجم رہنا چاہئے۔اس لحاظ سے اس شہر کی سڑکیں اور گلیاں گلیارے کی حیثیت رکھتی ہیں اور گھر، ان کمروں کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ایک خاندان رہتا ہے۔اس طرح شہر ایک گھر کی مانند ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں عمارت سے متعلق تشبیہات اور تقابل زیادہ بیان ہوئے ہیں۔" (بمات، ۱۳۶۹: ۸۸)۔

۵/۳۔روحانیت اور دین کی چاہت

گذشتہ چند دہائیوں میں جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی، شہر کے مختلف شعبوں میں ترقی اور پیشرفت کا سبب بنی ہے وہیں دوسری طرف سے انحرافات، مسائل اور متعدد مشکلات کے وجود میں آنے کی باعث بھی ہوئی ہے۔ اب انسان ان مشکلات اور مسائل سے نجات پانے کے لئے ناچار ہے کہ روحانیت کی طرف رجوع کرے اور ایک پیغام پر مشتمل ایسا نظام بنائے جس کی بنیاد روحانیت پر استوار ہو (صابری، ۱۳۹۳: ۲۴۵)؛ قرآن کریم جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کا سرچشمہ ہے، یہ معرفت و روحانیت کی کتاب ہے۔قرآن کریم، بہت سے شہری افراد کے دعووں کے برخلاف جو خود کو دین اور روحانیت سے الگ جانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ ہی راہ زندگی میں آگے بڑھا جاسکتا ہے، معرفت اور روحانیت کو زندگی سے جدا نہ ہونے والے جزء اور سعادت اور کامیابی کی راہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔

روحانی اقدار، روحانیت اور دینداری کی اہمیت کے بارے میں ملتا ہے کہ جو لوگ اقدار اور روحانیت کے پابند ہوتے ہیں ان میں زندگی سے راضی ہونے کی سطح دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بلند ہوتی ہے؛ یعنی وہ لوگ جن کا مذہبی اور روحانی عقیدہ مضبوط ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ جن کی روحانی پاکیزگی اور سلامتی کی سطح بلند ہوتی ہے، یا مذہبی معاشرے میں سرگرم رہتے ہیں انکے بارے میں ملتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے زیادہ راضی

رہتے ہیں(Markos & Marita, 2003)۔ روحانیت سے متعلق کتابیں اور متون اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر تعریفیں روحانیت کے دو پہلو ہونے کو بیان کرتی ہیں۔ اسکا پہلا پہلو مذہبی روحانیت ہے جس میں مقدس وجود یا اصل حقیقت کے تصور کو مذہبی سیاق اور طریقہ میں بیان کیا جاتا ہے، اور اس کا دوسرا پہلو، وجودی روحانیت ہے جس میں مقدس وجود یا اصل حقیقت کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوتا ہے۔(Hartz:2005)۔ قرآن کریم روحانیت اور معرفت کے ایسے امور سے سرشار ہے جن کے ذریعہ دیگر تمام پہلوؤں کے ساتھ، جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ تک رسائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اصل روح وفطرت، عالم غیب کے وجود اور شریعت کو روحانیت کے اہم اصولوں میں سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح قرآن میں عقل وخرد، اعتدال وتوازن اور بندگی کو روحانیت کے اجزاء کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو خود شناسی، فرض شناسی، ذمہ داری پر عمل، عشق وایثار۔۔۔ جیسے امور کے شکوفا اور ظاہر ہونے کا میدان فراہم کرتے ہیں (رجوع کریں: رود گر،۱۳۸۸)، تو ان امور کو اس راہ میں دینی اور قرآنی تعلیمات کے عنوان سے ذکر کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی مدینہ فاضلہ میں روحانی مقامات (خوبصورت اور بڑی مساجد) کی موجودگی، اسی طرح اخلاقی اور روحانی اصول کی تبلیغ اور ترویج، اس شہر کو روحانیت اور دینداری سے سرشار کرتی ہے، کیونکہ روحانیت انسانی وجود کا وہ اصلی جوہر ہے جو اس کی زندگی کے سفر کو مرتب اور معین کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ اس کی زندگی اپنی بہترین صورت اختیار کرتی ہے۔ روحانیت انسان کے غیر جسمانی اور غیر مادی پہلو کو شامل ہوتی ہے اس کا تجربہ انسانی زندگی کا خدا، خود اور قدرت وفطرت کے ساتھ رابطہ سے ہوتا ہے (O, Brien,2004)، اور یہی روحانیت انسان کو وجود کے کمال اور اس کی حقیقت کے سلسلوں سے نزدیک کرتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی سورہ رعد میں روحانیت کو اس لامحدود ہستی اور اسکی حقیقت کی شناخت، اس میں پائے جانے والے نظم وضبط، اسکی منظّم حرکات ورفتار کے معرفت کے ذریعہ کے طور پر بیان کیا ہے جس کی بنیاد اس اصل حقیقت اور واقعیت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت اور دینداری، جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی ایک اور خصوصیت شمار ہوتی ہے۔ اور اس کے بہت سے برکات اور آثار ہیں۔

۵/۴۔ اسلامی طرز زندگی

جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی ایک اور خصوصیت اسلامی طرز زندگی اپنانا ہے۔ طرز زندگی کے

تصور اور اس کی تاریخ میں غور و فکر کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسا مفہوم اور تصور ہے جو ہمیشہ سے انسانی افکار سے آمیختہ رہا ہے اور ان مغربیوں کے دعووں کے خلاف ہے جن کا خیال ہے کہ اس تصور سے سب سے پہلے آلفورڈ اڈلر نے روشناس کرایا تھا جبکہ یہ تصور اور مفہوم اسلام کے مختلف ادوار میں علماء اسلام کے ذریعہ بیان ہوتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں مختلف کتابیں تالیف کی جاچکی ہیں (شعبانی ساروی، ۱۳۹۲: ۱۳)؛ یعنی طرز زندگی کوئی نیا اور خاص تصور نہیں ہے جس کی گذشتہ چند دہائیوں سے پہلے، ماضی میں کوئی گفتگو ہی نہ ہوئی ہو بلکہ یہ تصور مختلف اسلامی ادوار میں بیان ہوتا رہا ہے بلکہ اس کی بہت سی علامتیں اس مدینہ فاضلہ کی خصوصیات میں بیان ہوئی ہیں جسے اسلامی مفکرین اور دانشمندوں نے ترسیم اور بیان کیا ہے۔ البتہ گذشتہ چند دہائیوں میں اس پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور مغربی معاشروں کی طرف سے اسے "Life style" کا عنوان کا دیکر کافی تبلیغ کی گئی ہے۔

اسلامی مدینہ فاضلہ کا ہر باشندہ اسلامی طرز زندگی سے مزین ہوتا ہے اور یہ طرز زندگی فرداًفرداً ہر شخص کی نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک نمونہ کے طور پر ہوتی ہے جسے ہم مجموعی طور پر ان تمام افراد کے اعمال و کردار سے اخذ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں جو اس خاص معاشرے کی ثقافت کے تحت ہوتے ہیں تو اس لحاظ سے جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ میں اسلامی طرز زندگی: اسلامی تعلیمات پر مبنی اور اس پر منطبق اعمال و رفتار کو کہتے ہیں اس طرح کہ اسلامی خصلتیں اور شخصیت انسان کے وجود میں ایک معنی دار اور بامقصد نظام کے صورت میں رچ بس جاتی ہے اور پھر تمام مسلمان باشندوں کے اعمال و کردار سے ظاہر ہوتی ہے (قطبی اور معاونین، ۱۳۹۳: ۹)۔ یعنی یہ وہی طرز اور شیوہ زندگی ہے جسے اسلامی مدینہ فاضلہ اور اس معاشرے کے افراد اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے زندگی کے طریقہ کے طور پر اختیار اور انتخاب کرتے ہیں۔ یہ طرز زندگی، اسلامی معاشرے کے ثقافتی اور سماجی نظام کو بیان کرتا ہے (آرمند اور رسولی نژاد، ۱۳۹۴)۔

اسلامی تعلیمات میں غور و فکر سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کس قدر عظیم صلاحیت اور گنجائش پائی جاتی ہے؛ کیونکہ اعتقادی اور فکری امور سے لیکر موجودہ زندگی میں اعمال و رفتار سے متعلق احکام تک جسے بھی ہم طرز زندگی کہتے ہیں سب اس پر معنی اور بامقصد اسلامی نظام میں موجود ہیں اور ہم ان امور کو انسانی تکامل اور سعادت کی راہ میں استعمال کر سکتے ہیں (موسوی اور معاونین، ۱۳۹۴)؛ اور یہی چیز اسلامی طرز زندگی کی توسیع اور ہمہ گیر ہونے کا سبب بھی ہے، اور اس کے علاوہ یہی چیز اسلامی تعلیمات پر مبنی معرفتی نظام کی توسیع اور اس کے نفوذ کا بھی سبب ہے جس نے دینی ثقافت کی طرف رجحانات کو بھی تقویت بخشی ہے (فاضل قانع،

۱۳۹۲)۔ قرآن میں طرز زندگی سے مربوط چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ نور کی ۳۲ میں شادی اور خانوادہ کی تشکیل، سورہ نساء کی آیت ۳۴ میں خانوادہ (اہل خانہ) اور گھر چلانے کا طریقہ، سورہ طور کی آیت ۲۶ و ۲۷ میں نرمی اور مہربانی سے پیش آنا اور طرز زندگی کے دیگر اجزاء کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ امور اسلامی طرز زندگی کی عظمت اور بلندی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کے تحقق کے لئے بہترین تعلیم، طریقہ اور آلہ قرار پا سکتے ہیں۔

۵/۵-اخلاق تعلیم وتربیت

جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ، اخلاقی فضائل کا مظہر ہے، اور اس کے باشندے اسلامی تعلیم وتربیت کی بنیاد پر ان اخلاقی صفات سے آراستہ اور مزین ہوتے ہیں۔ اخلاق کے کچھ مراحل جنہیں طے کرنے کے بعد انسان کے اندر کچھ خصوصیات، ملکہ اور صلاحتیں پیدا ہوتی ہیں جنہیں انسان اپنے اختیار اور مسلسل کوششوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور یہ خصوصیات اور صفات انسانی روح کے ساتھ ساز گار ہوتی ہیں۔ (مطہری، ۱۳۷۶: ۱۷)۔ اسلامی مفکرین اور دانشمندوں کے درمیان اخلاقی اصطلاح کا جو سب سے مشہور استعمال ہے وہ اس طرح ہے کہ اخلاق: "ایسے راسخ نفسانی اور روحانی صفات کو کہتے ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان سے ان صفات کے متناسب افعال بغیر کسی تامل اور غور وفکر کے صادر ہوں" (مسکویہ، بی تا: ۵۱)۔ اسلامی مدینہ فاضلہ میں نیک اخلاق اور اچھے صفات کا حامل ہونا اور اخلاقی فضائل کو کسب کرنا اہم اقدار شمار ہوتا ہے اور اس شہر میں ان کے حصول کا میدان بخوبی فراہم ہوا ہے اور اسمیں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ افراد کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ کیونکہ انسان کی اخلاقی تربیت اسمیں فضائل پیدا کرتی ہے اور رذائل یعنی برائیاں اور پست صفات ختم کرتی ہے اس طرح کہ تربیت شدہ نفس میں فضیلتوں سے آراستہ ہونے اور برائیوں سے دور ہونے کی صلاحیت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ انسان اخلاقی اقدار کا پابند ہو جائے اور اندرونی اور بیرونی رکاوٹیں انسان کو ان اقدار کی پابندی کرنے سے منحرف نہ کر سکیں (داوودی، ۱۳۸۹: ۶۷)۔

تعلیم وتربیت انسان کی سب سے اہم ضروریات میں سے ایک ہے (میرایگی و بہزادفر، ۱۳۹۳)۔ صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر انسان نہ تو مناسب راستہ پر چل سکتا ہے اور نہ ہی انسانیت کے اصل معنی کا ادراک کر سکتا ہے اور نہ ہی انسانیت کی بلندی اور عظمت تک پہونچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آسمانی اور خدائی کتابوں میں تعلیم وتربیت کو پیغمبران خدا علیہم السلام کا بلند ترین اور بنیادی مقصد قرار دیا گیا ہے اس لئے جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ

فاضلہ میں اس امر پر بہت تاکید کی گئی ہے اور اس شہر کے علمی، دینی اور تعلیمی مراکز وغیرہ اپنے باشندوں کی مناسب تعلیم وتربیت کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور یہ امر مدینہ فاضلہ کے دیگر میدانوں کو بھی شامل ہوتا ہے۔جب ہم قرآنی آیات میں غور کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں تعلیم وتربیت کے مسئلہ پر خصوصی مورد توجہ دی گئی ہے جیسے سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۹اور ۱۵۱، سورہ آل عمران کی آیت ۱۲، ۶۲، اور ۱۳۱، سورہ لقمان اور دیگر سورہ۔۔۔ کی آیات، زندگی کے اس بنیادی عنصر کو بیان کرتی ہیں اور خصوصاً جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ میں اس موضوع کو تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۶۔خلاصہ اور نتیجہ

جدید اسلامی تہذیب اپنے طور پر ایک عالی سطح کی تہذیب ہے جو تمام اجزاء کے ساتھ ایک عالمگیر تہذیب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اور اس تہذیب کی ایک خصوصیت اور اسکا جزء وہ شہر ہے جسے مدینہ فاضلہ یا آرزوؤں کے شہر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔اس مدینہ فاضلہ کے حصول پر مصلحان، خیر خواہ اور بزرگ افراد کی توجہ رہی ہے۔اور اللہ کی طرف سے بہترین مدینہ فاضلہ، بہشت کے طور پر بیان ہوا ہے اور دین اسلام کے پیروکاروں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآنی تعلیمات اور بہشت کی بیان شدہ خصوصیات کے تحت اس زمین پر اپنی گمشدہ بہشت کی تعمیر نو کریں اور اسے احیاء کریں۔مدینہ فاضلہ اور آرزوؤں کا شہر ایک ایسا تصور ہے جس تک رسائی کی تمنا انسان کو قدیم زمانہ سے رہی ہے جسے وہ کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

مختلف ثقافتیں اپنی ضرورتوں، اقدار، عقاید، اپنے معاشرے کی صلاحیتوں کے مطابق اس مدینہ فاضلہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اس کی تعریف کرتے رہے ہیں۔لہٰذا جب جدید اسلامی تہذیب میں مدینہ فاضلہ کی گفتگو کی جائے تو اس کے تمام جوانب اور میدانوں کو اس طرح بیان کیا جائے کے ان کا محور، مرکز اور بنیاد اسلامی اور قرآنی تعلیمات ہوں۔یہی وہ تعلیمات ہیں جن کے سہارے جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کا بہترین نقشہ کھینچا جاسکتا ہے اور اس کی تعمیر نو کی جاسکتی ہے اور اسے دیگر تمام مدینہ فاضلہ پر برتری عطا کی جاسکتی ہے۔

جدید اسلامی تہذیب میں مدینہ فاضلہ، ایک ایسا شہر ہے جو خاص دینی اور قرآنی تعلیمات کے پیش نظر تشکیل پاتا ہے اور ایک ایسا شہر ہے جو ماضی اور تاریخ سے جدا نہیں ہوتا اور نہ ہی مستقبل پر توجہ کے بغیر ہوتا ہے بلکہ ایسا

شہر ہے جس میں ماضی اور گزرے ہوئے افراد کے تجربات پر نگاہ ہوتی ہے اور ایسے دسترس میں موجود شرائط، حالات اور وسائل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی تمام بنیادیں دینی اور قرآنی تعلیمات پر استوار ہوتی ہیں۔ایسی تعلیمات جو انسانی فطرت کے مطابق اور اس سے سازگار ہوتی ہیں اور انسان کو سعادت اور کمال تک پہونچانے کے لئے نازل ہوئی ہیں۔

دینی اور قرآنی تعلیمات کے مطابق جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ میں، امن ومان، اتحاد و انسجام، روحانیت اور دینداری، اسلامی طرز زندگی، اخلاق اور دینی تعلیم وتربیت جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔اس شہر میں تمام چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کی خاطر اس طرح ہوتی ہیں کہ امن وامان، اتحاد و انسجام کے شرائط مہیا کرتی ہیں۔مزید اتحاد وانسجام کے ذریعہ امن وامان بھی اپنے تمام جوانب اور پہلوؤں میں تقویت پاتا ہے۔اسلامی مدینہ فاضلہ کے شہریوں اور باشندوں کا طرز زندگی اسلامی ہوتا ہے جو روحانیت اور دینداری کے ہمراہ ہوتا ہے۔اس شہر کے باشندوں کی تمام تعلیم وتربیت کی بنیاد قرآنی اور دینی تعلیمات ہوتی ہیں جو دینی طرز زندگی اور روحانیت پر مبنی اخلاق کی ترویج کرتی ہیں۔اسی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ جدید اسلامی تہذیب پر مبنی مدینہ فاضلہ کی تمام خصوصیات دینی اور قرآنی ہوتی ہیں جن میں یہ خصوصیات ایک مجموعہ کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں اور اپنے باشندوں کو مقام سعادت اور قرب تک پہونچانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ماخذ

۱۔قرآن کریم

۲۔ابن منظور محمد بن مکرم (۱۴۱۴ھ) لسان العرب، بیروت: انتشارات دار صادر۔

۳۔احسانی فرد علی اصغر، حمید رضا شجاعی و کیانا مالکی شجاع (۱۳۹۲)؛ "ارزیابی میزن احساس امنیت شہروندان در شہرہای جدید (مطالعہ موردی شہر اشتہارد)" فصلنامہ مدیریت شہری، شمارہ ۳۱ صفحات ۳۳۴-۳۱۷

۴۔اسفندیاری، مصطفیٰ؛ "آرمان شہر اسلامی از منظر امام رضاؑ"، فصلنامہ ی فرہنگ رضوی، سال چہارم، شمارہ ۱۵، صص ۹۹-۱۳۳

۵۔آرمند محمد علی، رسولی نژاد، سید پویا (۱۳۹۴)، "بررسی رابطہ سبک زندگی اسلامی با نشاط اجتماعی و رضایت از زندگی شہریزد"، مجموعہ مقالات نخستین ہمایش سبک زندگی؛ نظم وامنیت، زنجان: دانشگاہ زنجان، اردیبہشت ماہ

۶۔آقازادہ محسن، رحمتی سید مہدی (۱۳۹۴)۔"خوزہ ہا امنیت وآثار و نتایج آن در قرآن"، مجموعہ مقالات نخستین ہمایش سبک زندگی؛ نظم وامنیت، زنجان: دانشگاہ زنجان، اردیبہشت ماہ

۷۔ باقری، اشرف السادات (۱۳۸۶)، نظریہ ہای در بارہ ی شہر ہای قلمرو فرہنگ اسلامی، تہران، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر

۸۔ بمات، نجم الدین (۱۳۶۹)، شہر اسلامی، ترجمہ ی محمد حسین حلیمی و منیژہ اسلامبولچی، تہران، سازمان چاپ وانتشارات

۹۔ بہنیافر، احمد رضا (۱۳۸۸)، "آسیب شناسی فرہنگ و تمدن اسلامی در زمینہ تولید علم در جہان امروز"، فصلنامہ علوم اسلامی، سال ۴، شمارہ ۱۴

۱۰۔ جواہر دہی علی (۱۳۹۴)۔ "اصول قرآنی ہمدلی و ہمزبانی"، قابل پیگیری در http://yazdanpress.com/

۱۱۔ حجازی فخر الدین (۱۳۶۰)، نقش پیامبران در تمدن اسلامی، تہران، انتشارات بعثت

۱۲۔ داودی، محمد (۱۳۸۹) سیرہ تربیتی پیامبرؐ واہلبیتؑ، جلد سوم، تربیت اخلاقی، چاپ سوم، قم، پژوہشگاہ حوزہ ودانشگاہ

۱۳۔ رحمانی، جبار؛ جعفر آقایی، محمد رضا (۱۳۹۰)، "ویژگیہای بنیادین شکوفایی تمدن اسلامی، تلفیقی بودن ووحدت فرہنگی"، نشریہ راہبرد فرہنگ، شمارہ ۱۴و۱۵، صص ۹۹-۱۱۳

۱۴۔ رودگر، محمد جواد (۱۳۸۸)، "معنویت گرایی در قرآن، (مبانی، مؤلفہ ہا وکارکردہای معنویت قرآنی)"، فصلنامہ ی علمی پژوہشی علوم اسلامی، سال ۴، شمارہ ۱۸، صص ۳۲-۱۵

۱۵۔ سیاوشی کرم، سلیمانی فرند (۱۳۹۴)، "راہکارہای تقریب مذاہب در سیرہ وگفتار امام رضا علیہ السلام"، فصلنامہ علمی ترویجی مطالعات تقریبی مذاہب اسلامی (فروغ وحدت)، سال دہم، دورہ جدید/شمارہ ۳۹، صص ۸۴-۴۳

۱۶۔ شاہ سنی، شہرزاد (۱۳۷۷)، آرمان شہر نظامی گنجوی، کیہان فرہنگی، شمارہ ۱۴۸، آذر ودی، ۱۳۷۷

۱۷۔ شعبانی ساردلی رمضان (۱۳۹۲)۔ "مختصات سبک زندگی در جامعہ اسلامی با نگاہی بر فرمایشات مقام معظم رہبری" مجلّہ ہدایت، شمارہ ۱۴۴۔

۱۸۔ صابری نوقانی علی رضا (۱۳۹۳)، "بررسی نحوہ ی اثر گذاری معنویت دینی بر سبک زندگی شاد" مجموعہ مقالات ہمایش بین المللی روانشناسی وفرہنگ زندگی، جلد چہارم، چاپ اول، بوشہر، انتشارات موسسہ سفیران فرہنگی مبین

۱۹۔ فاضل قانع، حمید (۱۳۹۲)، سبک زندگی بر اساس آموزہ ہای اسلامی؛ قم، مرکز پژوہش ہای اسلامی صداوسیما

۲۰۔ فوزی یحییٰ وصنم زادہ، محمود رضا (۱۳۹۱)، "تمدن اسلامی از دیدگاہ امام خمینیؒ"، فصلنامہ پژوہشی تاریخ وفرہنگ تمدن اسلامی، سال سوم، شمارہ ۹، صص ۴۰-۷

۲۱۔ قطبی، ثریا؛ ہادوی اصغر؛ رہنما، اکبر و باغبانی، فاطمہ (۱۳۹۳)، "تحلیل مؤلفہ ہای اجتماعی سبک زندگی در روایات امام رضاؑ، مجلّہ مشکات، شمارہ ۱۲۳، صص ۳۴-۴"

۲۲۔ کاشفی محمد رضا (۱۳۸۴)، تاریخ فرہنگ و تمدن اسلامی، قم، مرکز جہانی علوم اسلامی

۲۳۔ گیلانی نجم الدین، جمینی داود، عباسی احمد (۱۳۹۴)، "نقش آموزه های قرآن کریم در اتحاد اقوام مختلف در صدر اسلام"، هفتمین کنگره پیشگامان پیشرفت، تهران، کتابخانه ملی۔

۲۴۔ مجیر شیبانی، نظام الدین (۱۳۳۷)، تاریخ تمدن از آغاز آفرینش تا تمدن مادی، تهران، دانشگاه تهران

۲۵۔ محمدیان مصمم، حسن؛ ضرغامی، سعید (۱۳۹۶)، "خاستگاه تفکر ارمانی و آرمان شهرها در دو مهد عظیم تمدن شرق و غرب (ایران-یونان)"، فصلنامه ی مطالعات مدیریت شهری، سال ۹، شماره ۲۹، صص ۶۶-۵۵۔

۲۶۔ مسکویه ابی علی، (بی تا)، تهذیب الاخلاق و تطهیر الاعراق، قم، انتشارات بیدار

۲۷۔ مصطفوی، سید حسن (۱۳۶۰)، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، تهران، بنگاه ترجمه و نشر کتاب

۲۸۔ مطلبی، مسعود و نادری، محمد مهدی (۱۳۸۸)، "بررسی تطبیقی مفهوم آرمان شهر در اندیشه سیاسی اسلامی، ایران و غرب"، فصلنامه ی مطالعات سیاسی، سال دوم، شماره ۶

۲۹۔ مطهری، مرتضی (۱۳۷۶)، فلسفه اخلاق، تهران، انتشارات صدرا

۳۰۔ منتظر القائم، اصغر (۱۳۸۷)، مقدمه ی مجموعه مقالات نخستین همایش آرمان شهر اسلامی، اصفهان، دانشگاه اصفهان

۳۱۔ موسوی، سید یوسف (۱۳۹۳)۔ "کارکرد رسانه در تامین امنیت جمهوری اسلامی ایران"، فصلنامه ی مطالعات حفاظت و امنیت انتظامی، سال نهم، شماره ۳۰، صص ۱۷۷-۱۳۹

۳۲۔ موسوی، سید محمد، توتی، حسین علی، موسوی، سید محمد رضا (۱۳۹۱)، "انقلاب اسلامی ایران و تحولات ژئوپولیتیکی مصر با تاکید بر فرصت ها و چالش های پیش رو)"، فصلنامه علمی پژوهشی پژوهشنامه انقلاب اسلامی، سال ۱، شماره ۴، صص ۱۶۴-۱۴۵

۳۳۔ موسوی، سید محمد رضا؛ طاهری، نجم الدین و رحیمی، ولی اله (۱۳۹۴)، "آموزه های دینی و راه کارهای تحقق سبک زندگی دینی"، مجموعه مقالات نخستین همایش سبک زندگی؛ نظم و امنیت، زنجان؛ دانشگاه زنجان، اردیبهشت ماه

جدید اسلامی تمدن میں اسلامی روحانی صحت کا مقام

گروہ مؤلفین: ڈاکٹر سید حسن مقدم نیا،
ڈاکٹر محمد علی محققی وامیر حسین علی محمدیان
مترجم: مولانا سید محمد جعفر زیدی

پیش لفظ

بے شک اسلامی روحانیت و معنویت سے بہرہ مند اور حقیقی معنی میں سنت نبوی وعلوی کی راہ وروش کے پیروکار اعلی صفات و کمالات کے حامل انسان ہی اس عظیم رتبہ تک پہنچ سکے ہیں جس کی جانب قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے اور انھوں نے اس سے اپنی روح کو جلا دے کر سکون و اطمینان حاصل کرلیا ہے۔ اور روح کو سکون و اطمینان پہنچا کر انھوں نے اپنے جسم و نفس کی سلامتی کو بھی حاصل کرلیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی اپنے آپ کو نجات دینے والے ان الٰہی فرمان کے مطابق ڈھال لے جنکا ذکر قرآن سنت اور اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں ملتا ہے تو بلا شبہ ایسا انسان فلاح وکامیابی کو حاصل کرلیتا ہے: "قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَا"

ہم پہلے سالم زندگی کے سلسلہ میں کچھ آیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

وَاللهُ يَدۡعُوا الی دَار السَّلامِ وَيَهدِی مَن يَّشَاءُ إِلىٰ صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡم (یونس۔ ۲۵)

وَمَا لِیَ لَا اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡن (یٰس۔ ۲۲)

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسۡئَلُكَ مُوجِباتِ رَحۡمَتِكَ وَ... وَالفَوزَ بِالۡجَنَّةِ وَالرِّضۡوَانَ فِی دَارِ السَّلَامِ (تعقیب نماز مغرب)

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسۡئَلُكَ الاَمَانَ يَومَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوۡنَ ، اِلَّا مَنۡ اَتَی اللهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ وَ اَسۡئَلُكَ اَلۡاَمَانَ يَومَ يَعُضُّ الظَّالِمُ (مناجات امیر المومنین علی علیہ السلام)

وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَسۡئُوۡلُوۡنَ (صافات، ۲۴)

اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡ لِی فِی قَلۡبِی نُوراً وَبَصَراً وَفَهۡماً وَعِلۡمًا اِنَّكَ عَلیٰ كُلِّ شَئٍ قَدِيۡرٍ

جامع اور کامل طور پر سلام اور سلامتی کی اہمیت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جسمی سلامتی، نفسیاتی سلامتی، سماجی سلامتی اور روحانی سلامتی، جس کا نتیجہ مختلف ثقافتی، اعتقادی، معاشی، علمی، تحقیقی، سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے روحانی سلامتی کے ساتھ پروردگار کی بندگی کرنا آیہ "وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا

لِيَعْبُدُوْنِ" (ذاریات، ۵۶) کی روشنی میں تخلیق کے نہائی مقصد کو حاصل کرنا ہے اور انسانی فطرت یعنی خداوند متعال کی بندگی کی راہ میں قدم بڑھانا ہے: وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْن ۔ (یٰس، ۲۲)۔ اس تحریر میں ہم ان انسانوں کی خصوصیات کی جانب اشارہ کریں گے جو روحانی و معنوی سلامتی کے حامل ہیں۔

مومن بندوں کے خصوصیات

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوا سَلَامًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (فرقان/ ۶۳۔۶۵)

اسی طرح سے یہ خیال رہے کہ مومن اور بندگان الٰہی مذکورہ بالا خصوصیات کے حامل ہونے کے علاوہ قدرت خلاقیت و نشو نما کے مدارج سے بھی بہرہ مند ہیں اور ایسے توحیدی انسان ہی زمین پر خلیفہ خدا ہونے کا امتیاز رکھتے ہیں چونکہ ایسے انسان رنگ خدائی میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور بالیقیں روحانی، جسمانی، نفسیاتی اور سماجی سلامتی کے حامل ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُوْنَ (بقرہ، ۱۳۸)

الٰہی رنگ ہے جس نے ہمیں ایمان، سیرت اور توحید کا رنگ عطا کیا ہے اور خدا پر ایمان سے بہتر کونسا رنگ ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

اسلامی طرز حیات اور نفسیاتی سلامتی

مومن اور نیک عمل انجام دینے والا شخص جو اسلامی طرز زندگی سے سرشار اور حیات طیبہ سے بہرہ مند ہے اسے نفسیاتی اور قلبی چین و سکون بھی رہتا ہے، حقیقت میں ایسے انسان جنکی جڑیں شجرہ طیبہ میں موجود ہیں وہ شجرہ خبیثہ کے مدمقابل ہیں اور خدا کی یاد، سکون و اطمینان کا ذریعہ ہے: "الَّذِيْنَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (رعد/۲۸) یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دُلوں کو یاد خدا سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اطمینان یادُ خدا سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی طرز حیات اور سماجی سلامتی

مختلف تحقیقات اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ اسلامی طرز حیات اور سماجی سلامتی کے درمیان براہ راست اور عمیق رابطہ ہے کیونکہ سماج میں اسلامی طرز زندگی کو عام کرنا حقیقت میں سماجی سلامتی میں اضافہ ہونے کا سبب ہے۔ اسلامی طرز زندگی، سماجی ہم آہنگی، قبولیت، سماجی شمولیت پر اثرانداز ہو کر نمایاں طور پر سماجی سلامتی کی سطح کو ترقی عطا کر سکتی ہے۔

اسلامی طرز حیات اور روحانی و معنوی سلامتی

اگرچہ دین مبین اسلام میں براہ راست روحانی و معنوی سلامتی کے بارے میں کوئی قول یا فرمان نہیں ملتا ہے لیکن شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں بہت سے ایسے مفاہیم ذکر ہوئے ہیں جو روحانی و معنوی سلامتی کی جانب اشارہ کرتے ہیں: جیسے شجرہ طیبہ، حیات طیبہ، قلب سلیم، رحمٰن کے بندے وغیرہ یہ تمام مفاہیم دلالت کرتے ہیں کہ اسلامی طرز زندگی میں روحانی و معنوی سلامتی کا کتنا بڑا کردار ہے۔ مندرجہ ذیل آیتوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں:

۱۔ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (یونس/۲۵) اللہ ہر ایک کو سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی ہدایت دے دیتا ہے۔

۲۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿۲﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿۳﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ﴿۴﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿۵﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿۷﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿۸﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۹﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ﴿۱۰﴾ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱﴾ (مومنون، آیت ۱تا۱۱)

یقیناً صاحبانِ ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں گڑگڑانے والے ہیں اور لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور زکات ادا کرنے والے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں علاوہ اپنی بیویوں اور اپنے ہاتھوں کی ملکیت کنیزوں کے کہ ان کے معاملہ میں ان پر کوئی الزام آنے والا نہیں ہے پھر اس کے علاوہ جو کوئی اور راستہ تلاش کرے گا وہ زیادتی کرنے والا ہوگا اور جو مومنین اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں درحقیقت یہی وہ وارثان جنّت ہیں جو فردوس کے وارث بنیں گے اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

روحانی و معنوی سلامتی کا لازمہ یہ ہے کہ اسلامی طرز حیات کو اپنایا جائے، رہبر انقلاب حضرت آیت اللہ خامنہ ای اس سلسلہ میں یونیورسٹیز اور دینی مدارس کے طلاب، کلچرل ڈپارٹمنٹ کے عہدیداروں اور ملک کے خواص افراد کو خطاب کرتے ہوئے انھیں لازمی طور پر صحیح طرز زندگی اپنانے کی تاکید کرتے ہیں۔

" ترقی کا سفر ہمیشہ جاری و ساری ہے اور اس سلسلہ میں طرز زندگی، سماجی اخلاق و کردار اور زندگی گزارنے کا طریقہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔" (رہبر معظم حضرت آیت اللہ خامنہ ای کی تقریر سے ماخوذ)

مواد اور طریقے

قرآن مجید کے ڈیجیٹل اور مربوط تفسیروں کی جانب مراجعہ کرکے طرز زندگی سے متعلق الفاظ اور روحانی و معنوی سلامتی سے مربوط آیتوں کی جستجو کی گئی پھر مفسرین کے نظریات اور موضوعی رابطے کی بنیاد پر ان کی جمع بندی کی گئی ہے۔

ماحصل

سماج کی روحانی و معنوی سلامتی کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اور سنت نبوی و مکتب علوی کی پیروی کرنا نہایت اہم اور لازمی ہے اسی طرح سے انسان کے مختلف اور پیچیدہ پہلوؤں جیسے جسمانی، نفسیاتی، روحانی، سماجی اور معنوی کی جانب توجہ بھی تخلیق کے مقدس مقصد کے حصول اور منصوبہ بندی کے لئے ضروری ہے۔ (خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفاً. خُلِقَ الاِنْسِانُ هَلُوعاً. خُلِقَ الانسانُ فِی کَبِدٍ و۔۔۔) اسلامی تعلیمی اور تربیتی نظام کا اہتمام اور تعلیم و تحقیق کے سایہ میں پرورش کرنا اور شاگردوں کی روحانی و معنوی سلامتی کی سطح کو بڑھانا اور انکے اندر سیاسی بینش اور آگہی ایجاد کرنا اور مومن شاگرد و اساتذہ کی تربیت جو اخلاقی اقدار، قوانین اسلامی کا پابند، اسلامی انقلاب کا وفادار اور ملک کی سربلندی کا خواہاں ہو ساتھ ہی ساتھ اسلامی حدود اور ثقافتی و سماجی اقدار کا محافظ بھی ہو۔

" طرز زندگی نئے اسلامی تمدن کو زندہ اور فروغ دینے کا بنیادی اور حقیقی حصہ ہے، دانشوروں، خواص اور صاحبان فکر و اندیشہ کو چاہئے کہ اس اہم مفہوم کو لوگوں کے درمیان رائج کریں اور فی الحال ایران میں موجود طرز زندگی کے نقصانات اور اسکے راہ حل کو تلاش کریں۔" (رہبر انقلاب حضرت آیت اللہ خامنہ ای کے بیان سے ماخوذ)

عملی حکمت اور طرز زندگی کے درمیان رابطہ

عملی حکمت میں حیاتی پہلوؤں کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے جیسے علم اخلاق اور تہذیب نفس، گھر کی دیکھ بھال اور خاندانی تعلقات، ماڈرن سیاست اور ملک و سماج کا مینجمنٹ۔ علماے اخلاق تمام اخلاقی اصولوں کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت۔ اور اس تقسیم بندی کی بنیاد یہ ہے کہ انکے نزدیک انسان تین قوتوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ تین قوتیں مندرجہ ذیل ہیں: قوت فکر، قوت شہوت اور قوت غضب۔ قوت فکر کی حالت اعتدال کو حکمت کہتے ہیں، قوت شہوت کی حالت اعتدال کو عفت کہا جاتا ہے اور قوت غضب کی حالت اعتدال کو شجاعت سے یاد کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں ان تینوں قوتوں کی وہ حالت اعتدال کے قائل ہیں اور انسان کی تمام جسمانی، مادی اور روحانی سرگرمیوں کا منشا یہی تین قوتیں ہیں۔ اخلاق حکمت اور روحانی سلامتی کا رابطہ اس حدیث سے سمجھ میں آتا ہے "اَفْضَلُ الحِکْمَةِ مَعْرِفَةُ الْاِنْسَانِ نَفْسَهٗ وَ قُوتَهٗ عِنْدَ قُدرَتِهٖ" یعنی بہترین حکمت یہ ہے کہ انسان کو خود کی معرفت ہو تاکہ اپنے نفس اور اپنی قدر و قیمت کو پہچان سکے۔ انسان کو اس دینی و آسمانی نقطہ نظر سے دیکھنا یعنی انسان کی صحیح شناخت، اسکی تخلیق کا مقصد اس کی قدر و منزلت کو اچھی طرح پہچاننا ہے اور اسی بنیاد پر ہی وہ صحیح طرز زندگی اور سالم ضابطہ حیات رکھ سکتا ہے۔ البتہ اسکی تفصیل اس تحریر کی گنجائش سے باہر ہے۔ انسانی زندگی میں روحانی و معنوی سلامتی کو ارتقاء دینے کی راہ میں کچھ رکاوٹیں بھی پائی جاتی ہیں جیسے خداوند متعال سے غفلت، حسد، کینہ، غیض و غضب، (دشمان خدا کے مقابلہ میں غضب لازمی ہے) جھوٹ، لالچ، خدا کی ذات پر توکل نہ ہونا، صبر کا نہ ہونا وغیرہ لیکن ایک مومن و پرہیزگار انسان، الٰہی آیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ان رکاوٹوں کو ہٹاتا جاتا ہے۔

خلاصہ

اخلاقی مباحث کو "حکمت، عفت، شجاعت، اور اعتدال" میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اعتدال تمام قوتوں پر غالب و حاوی ہے اس لئے اگر اعتدال نہ ہو تو کوئی بھی اخلاقی اصول قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا غضب و شہوت کو اخلاقی اعتدال کے سایہ میں کنٹرول کیا جاتا ہے اور اخلاقی اعتدال، عقلانیت و ایمان کے ذریعہ قابل دسترس ہے اور دین کا جوہر بھی اسی میں ہے کہ اخلاقی اعتدال، سماجی اعتدال کی بنیاد و اساس ہے "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (۴)

" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً۔" (۲۱)

روحانی و معنوی سلامتی کا حصول، قائم آل محمد ﷺ کے ظہور کی راہ ہموار کرنے میں نہایت اہم اور مددگار عنصر ہے جو کچھ مقدمات کو فراہم کرکے جیسے کامل اسلامی حکومت کا نفاذ، عالمی مستضعفین کی انجمن بنانا اور آہستہ

آہستہ نئے اسلامی تمدن کو ایجاد کرنے کی طرف جانا۔ اسلامی انقلاب کے معمار اور بانی حضرت امام خمینیؒ نے چالیس سال تک دشمنوں کا مقابلہ بہادر و دلیر عوام اور حکومت کے قابل عہدیداروں کے ذریعہ کیا اور عالمی استکبار کی تمام نفرت انگیز سازشیں حضرت امام خمینیؒ کی بابصیرت رہبری، رہبر انقلاب سید علی خامنہ ای کی دور اندیشی، عوام کی ثابت قدمی و شہامت اور سیکڑوں شہیدوں، غازیوں اور مدافعین حرم کی جانفشانیوں، حکومت کے غیرت مند عہدیداروں اور مراجع عظام کی دعاوں کی وجہ سے بے ثمر ہو چکی ہیں۔

منابع و مآخذ

۱۔ قرآن کریم

2 Stanford University (2006). Lifestulyes available at

fsi.stanford.edu/sites/default/files/lifestyle/.pdf.Acccessed 1Oct 2014

۳۔ مقدم نیا حسن، فرهود داریوش، مالمیر مریم (۱۳۹۶)۔ طرز زندگی اور صحت و سلامتی عنوان پر ماسٹرز کے تعلیمی نصاب کو بنانے میں اخلاقی تحفظات، سہ ماہی رسالہ اخلاق در علوم و فناوری۔ ۱۲ (۳) : ۱۔۸

۴۔ نہج البلاغہ

۵۔ سبک زندگی و مصرف فرہنگی : ثقافتی سوشیالوجی کے شعبے میں ایک مطالعہ اور ایرانیوں کے ثقافتی طرز زندگی کا تعارف، مصنف : طلیعہ خادمیان، نشر جہان کتاب، ۱۳۸۸

۶۔ مہدوی کنی، محمد سعید (۱۳۹۰) دین و سبک زندگی، تہران، امام صادق علیہ السلام یونیورسٹی۔

۷۔ طلایی مرتضی، (۱۳۹۲)۔ سبک زندگی و حاکمیت سیاسی

شکریہ

محترمہ شہبازی صاحبہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالہ کی تحریر میں میری مدد کی اور اپنے لطف و عنایت سے نوازا۔

جدید اخلاقی تمدّن، فقہ سیاسی کی بالیدگی کا مرکز

گروہ مؤلفین: سید علی پور منوچہری[۱]، محمد رضا فارسیان[۲]

مترجم: سید اطہر عباس رضوی الہ آبادی

خلاصہ

حالیہ دور میں اسلامی حاکمیت اقوام و ملل اور افراد بشر کے سامنے جدید اسلامی تمدّن کی صورت میں اپنے سیاسی چہرہ کی تعمیر نو کی طلبگار ہے۔ یہ تحریک جو دینی حاکمیت کی صورت میں سیاسی طور پر جلوہ گر ہوئی ہے تحریک فقاہت کو مناسب موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی شایان شان کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی ہے۔ ظنون خاصّہ کی بالا دستی میں ناموزوں بستر سازی [گراؤنڈنگ] کا نتیجہ، اجتماعی اور حاکمیتی رشتوں کو توڑنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر کی توسیع و ترقی کے ہمراہ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لئے ظنّ عقلائی اور عقل اجتماعی دونوں کی کارکردگی اور استفادہ میں مطابقت نظر آتی ہے۔ تمدّن ساز اسلام کے بارے میں امام خمینی کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے، اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جدید اخلاقی تمدّن جو کہ فقہی حاکمیت کے لئے ایک جدید مثبت نظریہ ہے، اخلاق مدار ظنّ عقلائی کے عنوان سے تمدّن ساز فقہ کی اولویت کے ایک خاص شعبے سے تمدّن نامی ایک مترقی زندگی سے ہمیں روشناس کراتا ہے؛ اور یہی وہ مقصد ہے جس کو اس تناظر میں ضروری خیال کیا گیا ہے کہ کوئی بھی نظریہ اخلاقی اور عقلانی فقہ کی اصلاح کے بغیر آزادی اور مدارات کی محوریت کے ساتھ استوار نہیں ہوتا ہے۔

مقدّمہ

تشیع کا فقہ سیاسی کا نظریہ ہمیشہ اپنی ترقی اور کمال کی راہ میں گوناگوں تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ اس کمال تدریجی نے ہر دور اور ہر زمانے میں پوری دنیا کی رہبری کے لئے نمونہ کے طور پر ایک تمدّن کی تعمیر کی ہے۔ تمام ادیان و فرق کے درمیان اور اسی طرح عام طور پر دنیا کے تمام لوگوں کے درمیان جو مشترک عنصر ہادی و مہتدی یعنی

۱۔ دانشگاہ آزاد اسلامی تہران کے شعبۂ فقہ و حقوق میں معاون استاد۔
۲۔ دانشگاہ آزاد اسلامی تہران میں فقہ و حقوق اور افکار امام خمینی کے شعبہ میں پی ایچ ڈی کے طالبعلم (محرر، مسئول: Mohamadreza. Farsian67 gmail com)

رہبری اور ہدایت یافتہ ہونے کی خاصیت سے بہرہ مند ہے ،وہ صرف اخلاق ہے۔اخلاق تمام انسانوں کے درمیان ایک مشترک فہم کے عنوان سے بظاہر مختلف دکھائی دینے والی زندگیوں کو مشترک مقصد تک رہنمائی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ظواہر اسلام جو قول ظاہری کی مسندیّت سے قبائے خبر واحد میں منعکس ہوئے ہیں، وہ قوانین و معارف کے بیان میں بکثرت اختلافات کی وجہ سے عالمی تمدّن تک رسائی پانے کے لئے ہادی و رہبر ہونے کی خاصیت سے محروم ہیں۔حالیہ تحقیق ، اس بات پر ہے کہ یہ ضرورت ہمارے دور میں اسلام واقعی اور عصر حاضر کے اقتضائات کو سمجھ کر مظونات عقلائیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ملّتوں کی رہبری میں اپنی ذاتی اصالت کو پانے کے لئے اپنے طریقۂ کار کو آگے بڑھانے میں اخلاقِ عقلانیت کے طریقۂ کار کو آزادی اور مدارات جیسے عناصر سے استفادہ کرنے اور ان کی تعمیر نو کی ضرورت ہے جو اخلاق عقلانی کے ذیل میں روشن اور جلوہ گر ہوتے ہیں۔یہ تحقیق اس تناظر میں امام خمینی کے آراء و نظریات پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اور ایک نئی فکر کی دوبارہ تخلیق کے ضمن میں اخلاقی تمدّن کی فوقیت وبرتری کو اسلام کے جہان شمول قواعد و قوانین کا موضوع شمار کرتی ہے۔

فقہ اور سیاسی فقہ

سیاسی فقہ عالم اسلام میں علمِ عمومیِ فقہ کا ایک حصہّ ہے جس کو اپنی اہمیت اور اس دور کی وسیع و بے پایاں جدوجہد کے باوجود بہت کم ترقی اور وسعت ملی ہے۔ فقہ، لغت میں فہم وآگاہی کے معنی میں ہے[۱]اور فقہ، آج کی اصطلاح میں حکمِ شرعی کے علم سے عبارت ہے۔[۲] سابق فقہائے عظام نے فقہ کی ایک وسیع تر اور عام تعریف کی ہے اور اس کو تمام احکام دین کے سمجھنے سے تعبیر کیا ہے اور اس میں ایمان، عقیدہ اور عمل سب کو شامل کیا ہے۔[۳] کہا جاتا ہے کہ فقہ، لسانِ ائمّہ معصومین علیہم السلام میں عقل عملی کے تمام احکام منجملہ اخلاق وغیرہ کو بھی شامل ہے۔لیکن بالتدریج اور متاخرین کے استعمالات میں شریعت کے ظاہری احکام سے مختص ہو گیا ہے[۴] حکم ظاہری، حکم واقعی کے مقابلے میں ہے اور لفظ"ظاہری" سے فقہاء شیعہ کی مراد،احکام شرعی کی غیر قطعی اور ظنّی ماہیت پر تاکید اور اصرار کرنا ہے۔[۵] اسی وجہ سے فقہائے اسلام نے اجتہاد کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ اجتہاد، حکم شرعی[۶] کے ظنّ تک پہونچنے کے لئے انتہائی کوشش کا نام ہے۔

بہر حال فقہ، مشہور فقہاء اسلام کی تعریف کی رو سے ادلّہ تفصیلی[۷] یعنی کتاب ،سنّت، عقل اور اجماع سے شریعت کے فرعی احکام کو استنباط اور استخراج کرنے سے عبارت ہے۔[۸] فقہ، اسلامی تمدّن میں ایک مسلمان

انسان کی عملی رہنمائی کرتا ہے اور اس کی شخصی و اجتماعی زندگی کو شامل ہے؛ یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی عملی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے افعالِ مکلّفین، فقہ عمومی کا موضوع ہیں اور احکام خمسہ یعنی وجوب، حرمت، استحباب، کراہت، اور اباحہ نیز صحت و بطلان، یہ تمام مسائل اس علم کو تشکیل دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان انسان کی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح سیاسی احکام بھی کوشش و تفحّص اور احکام فقہ کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس تعلق سے کہ فقہ کی ایک سیاسی بنیاد ہے یا سیاست، فقہ کا ایک شعبہ ہے، وحدت نظر کا فقدان ہے؛ اور شائد انسان کی زندگی کے کسی ایک بھی رخ کو سیاست سے خالی تصور کرنا بالکل بھی ناممکن ہے؛ یعنی انسانی زندگی کے ہر رخ میں سیاست ایک اجتناب ناپذیر اور لابدّی امر ہے۔ [۹]

فقہ کی دوگانہ [۱۰] اور چہارگانہ [۱۱] تقسیمات میں فقہ سیاسی کے لئے قانونی طور پر کوئی بھی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ شائد فقہاء اسلام کسی فقیہ کے ذریعے ادارۂ حکومت کو بعید جانتے تھے۔ بہر حال ابواب فقہ کی تقسیم میں جو نئی کاوشیں کی گئی ہیں، اس میں فقہِ سیاسی کی جانب بھی ایک صریح تر اشارہ مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ [۱۲] لیکن فقہائے معاصر کی فقہی ادبیات میں عام طور پر مشہور کی دوگانہ تقسیم، یعنی عبادات اور معاملات کا تحفظ کیا گیا ہے اور فقہ کے سیاسی احکام کی باب معاملات کے ذیل میں وضاحت و تشریح کی گئی ہے۔ [۱۳] اسی طرح فقہ کا ہدف اور بنیادی مقصد، دنیا و آخرت کی سعادت کے حصول کے زیر سایہ روح انسان کی پرورش کے علاوہ، اصلاح فرد و معاشرہ، تحصیل سعادت دنیا و آخرت، عدالت اجتماعی کا قیام اور امّت اسلامی کے حقوق کی حفاظت و پاسداری ہے۔ غزالی کہتے ہیں: احکام فقہی، دین، نفس، عقل، عمل اور ناموس، ان پانچ مصالح کی حفاظت و پاسداری کرنے کے لئے ہیں۔ [۱۴] شہید اوّل نے بھی ضروریاتِ خمسہ یعنی دین، نفس، عقل، نسب اور مال [۱۵] کو بیان کرنے کے ضمن میں ہر اس چیز کو جو انسانی معاشرے میں جلبِ منفعت اور دفعِ مفسدہ کا وسیلہ اور ذریعہ ہو، احکام شریعت میں داخل جانا ہے؛ اور امامت و سیاست اور حکومت کی ان امور کے ذیل میں تحلیل کی ہے۔

فقہ حکومتی

فقہِ حکومتی تمام ابواب فقہ پر ناظر ہے اور ایک محیط علی الکل دید سے عبارت ہے۔ اس دید میں فقہی استنباطات کو فقہِ ادارۂ نظام اجتماعی کی بنیاد پر انجام پانا چاہئے اور تمام ابواب فقہ کی اجتماعی امور اور ادارۂ مملکت پر نظارت ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے جو چیزیں فقہ حکومتی میں موضوع بحث قرار پاتی ہیں، وہ سب کے سب فقہی ابواب و مسائل سے عبارت ہوں گی۔ کیونکہ اجتماع اور ادارۂ نظام اسلامی کے مختلف درجات و مراتب ہیں: اور یہ

درجات و مراتب، اقتصاد، تمدّن، حقوق، سیاست، بین الاقوامی مسائل سے متعلق شعبہ اور اسی طرح عسکری، انتظامی اور خانوادگی مسائل، شخصی احوال نیز مادی و معنوی اور دنیوی و اخروی موضوعات میں بشری زندگی سے مربوط مسائل وغیرہ سے عبارت ہیں۔ ایک فقیہ کو چاہئے کہ ان تمام مسائل کو اجتماعی اور اسلامی نظام کی احتیاجات کی تکمیل کی بنیاد پر تحقیق کا موضوع قرار دے تاکہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔[۱۶] بلاشک و تردید، اس دید کی توسیع کے لئے ایک حکومت کی تاسیس اور ایک تمدّن کی بنیاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

حکومتی فقہ اور سیاسی و فردی فقہ کے درمیان فرق

فقہ حکومتی جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، فقہ کے بعض شعبے یا فقہِ احکام حکومتی [۱۷] یا فقہ سیاسی [۱۸] کے معنی میں نہیں ہے؛ بلکہ ایک حاکم اور وصفی نگاہ ہے جو طہارت سے لے کر دیات تک تمام مباحث فقہ [۱۹] نیز مسائل مستحدثہ [جدید مسائل] کو شامل ہے جبکہ فقہ سیاسی جو صرف فقہ کا ایک جزء ہے، ایک حاکم اور وصفی نگاہ، اس کے باوجود بھی اس کے فردی اور غیر حکومتی مصادیق بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح فقہ حکومتی اور فقہ فردی کا فرق ایک اہم وصف کے عنوان سے اس بات کی غمازی اور نشان دہی کرتا ہے کہ فقہ حکومتی میں احکام الٰہی کی موجودگی سے زندگی کے تمام شئون و حالات میں ایک نظام اور ایک حکومت مدّ نظر ہے؛ اور تمام فقہی احکام کو حکومتی زاویۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور احکام الٰہی میں سے ہر حکم کی احتمالی تاثیر، نظام اور حکومت کو بعنوان احسن ادارہ کرنے میں ملاحظہ ہوتی ہے۔ لیکن فقہ سنّتی اور فردی میں، موضوعات اور مسائل، فرد کو دیکھتے ہوئے اور ہر طرح کے حکومتی ملاحظات سے دور، سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ خود موضوعِ حکمِ شرعی کے عنوان سے استنباط کا موضوع قرار پاتے ہیں۔[۲۰] فقہ فردی کی نگاہ زیادہ سے زیادہ افعال مکلّفین پر ہوتی ہے اور فقہ حکومتی کی نگاہ، مکلّفین اور اجتماع کے افعال پر ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ نگاہ جامع جو تمدّن نامی تنومند درخت کی پھر سے آبیاری اور اس کو ہرا بھرا کر سکتی ہے وہ فقہ حکومتی کی موجودیت اور قوام سے نمودار ہوتی ہے جبکہ فقہ فردی کسی ایسی ماہیت کو خلق کرنے کی قدرت و توانائی نہیں رکھتی ہے۔

فقہ کی رسالت

اسلام دین خاتم ہے اور تمام ادوار میں انسان کی ضرورتوں کے لئے جوابدہ ہے۔ اس درمیان اسلام کے عملی دستورات و قوانین اور اوامر و نواہی ہیں جو زیادہ رشد و نمو کرتے ہیں اور فقہ کی رسالت کو روشن و آشکار کرتے ہیں۔ علم فقہ کو

دینی تعلیمات اور معارف میں ایک خاص مقام حاصل ہے؛ کیونکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں راہ و روش زندگی کی نشان دہی کرتا ہے۔ مناسک و عبادات، معاملات، حلال و حرام، نظام ازدواج، میراث، کیفیت قضاوت اور رفع خصومت وغیرہ کی توضیح و تبیین کرتا ہے۔الغرض فقہ مسلمانوں کی اجتماعی اور فردی زندگی کے لئے ایک منفرد اور بے مثل راہ و روش اور ایک منظّم اور دقیق پروگرام ہے۔[۲۱]

جو چیز اس رسالت کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہے وہ دین مبین اسلام کی خاتمیت اور اس کے مضمون سے اخلاقی و انسانی زندگی کو فائدہ پہونچانے کی ضرورت ہے اور اس چیز نے اپنے تشریعی خصائص کے ساتھ عقلانی اور عقلائی مبادی کے درمیان انسجام و انتظام کی توانائی فراہم کی ہے۔

تمدّن

تمدّن، لاطینی لفظ Civitas سے قدیم یونانی لفظ Poleis کا مترادف ہے ۔اہل یونان قدیم، لفظ تمدّن (civilization) کا استعمال کرکے یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ شہر کو ادارات اور سماجی روابط و تعلقات کا ایک مجموعہ جانتے ہیں جو زندگی کی اعلی شکل کی تخلیق کرتا ہے۔[۲۲] اسی طرح تمدّن، اجتماعی و اقتصادی اور سیاسی و دینی امور میں ایک سماج کے افراد کے درمیان باہمی تعاون نیز شہریوں کے آداب و اخلاق کو اپنانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔[۲۳] تمدّن بنیادی طور پر اس وقت وجود میں آتا ہے جب انسان بدوی زندگی کو چھوڑ کر شہری زندگی کا آغاز کرتا ہے؛ البتہ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ تمدّن، شہری زندگی سے مخصوص نہیں ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک متمدّن انسان شہری زندگی اختیار کرتا ہے۔[۲۴]

ویل ڈورانٹ تمدّن کو معاشرہ انسانی کے مادّی و معنوی ذخائر اور مواد کے مجموعہ سے عبارت جانتا ہے۔ [۲۵] ڈورانٹ کے مطابق ایک شہر ہی ہے جہاں کچھ لوگ علمی و فلسفی اور ہنری مراکز قائم کرنے کی سوچتے ہیں اور اپنی اس فکر کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔اس بات کو مؤلّفِ تاریخِ تمدّن تمثیل کی صورت میں بیان کرتا ہے کہ ”مدنیت ایک تخم پاشی کرنے والے کسان کی جھوپڑی میں اپنی آنکھ کھولتی ہے اور شہروں میں پروان چڑھتی ہے“ وہ اس کا آغاز زراعت کو جانتا ہے اور اس کا اوج کمال شہر نشینی میں دیکھتا ہے۔[۲۶] یوکیچی کا عقیدہ ہے کہ تمدّن اپنے محدود معنی یعنی تجملات کی افزائش اور انسان کے مصارف اور اپنے وسیع تر مفہوم یعنی اخلاقی فضائل کے رشد و نمو پر بھی توجہ رکھتا ہے اور انسان کی زندگی کو بلند و بالا درجے تک پہونچاتا ہے۔[۲۷] ہر چند شہر نشینی ہونا اور شہر میں اقامت (مدنیّت) اصلی ترین اور حقیقی معنی ہیں جو تمدّن کے لئے اپنائے اور عمل میں لائے گئے ہیں، لیکن اس کے مادّہ لغوی کے تعین میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے، چنانچہ بعض اس کو ”مدن“ یعنی

اقامت گزینی کی طرف اور بعض اس کو ''دان'' کی طرف پلٹاتے ہیں جس کی اصل دین ہے اور خضوع و اطاعت کے معنی میں ہے۔[۲۸] بنابراین، متمدّن زندگی کا استعمال جنگلیوں کی زندگی کے مقابلے میں ہوا ہے جو شہر نشینی کی زندگی سے محروم ہوتے ہیں۔ ہانتیگٹون تمدّن کو بلندترین ثقافتی گروہ بندی اور وسیع ترین ثقافتی سطح ماہیت سے عبارت جانتا ہے۔[۲۹] بعض تمدّن کو ایک دوسرے سے مربوط اور جڑی ہوئی ایک چیز سمجھتے ہیں جو اجتماعی و اقتصادی اور سیاسی تمام رودادوں یہاں تک کہ ہنر کو بھی شامل ہے۔[۳۰] آرنولڈ توین بی معتقد ہے کہ تمدّن ایک مبتکر اور نوآور اقلیّت کے نبوغ کا حاصل ہے، یعنی سماج کا ایک ممتاز طبقہ جو ابتکار و نوآوری کے نبوغ سے سرشار اور لبالب ہے وہ معاشرتی تبدیلیوں اور معاشرہ کے رفتہ رفتہ روبکمال ہونے کے نتیجے میں تمدّن کی داغ بیل ڈالتا ہے۔[۳۱]

تمدّن کی اصطلاح اٹھارویں صدی اور روشن فکری کے دور سے وجود میں آئی ہے۔ ہرچند اس کی حقیقت پہلے سے موجود تھی۔ ایک معنی میں فرہنگ اور تمدّن کو مترادف جانا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تمدّن، فرہنگ کے ساتھ ایک پیچیدہ امتزاج اور ترکیب سے عبارت ہے جو علوم، اعتقادات، ہنر، اخلاق و قوانین، آداب و رسوم، عادات و خصائل اور دوسرے اعمال و افعال کو شامل ہے جو بذریعۂ انسان معاشرے میں داخل اور پھیلتے ہیں۔[۳۲] فرہنگ کے مادّی مظاہر کا ظہور اور شہر نشینی میں اس کا مجسّم ہونا تمدّن کا ایک دوسرا فرض شدہ مفہوم ہے۔

تمدّن کے تعلق سے ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جو ایک ہمہ گیر اور وسیع تر معنی و مفہوم کو شامل ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کے نرم اور ثقافتی پہلو کے علاوہ اقتصادی و سیاسی عناصر، علوم و فنون، اجتماعی ادارے اور کل ملا کر سخت پہلو بھی تمدّن کے حدود میں آتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق تمدّن، اجتماعی حوادث و واقعات اور مظاہر کے ایک مجموعہ سے عبارت ہے جو قابل نقل و انتقال ہو اور ایک سماج یا ایک دوسرے سے مرتبط چند سماج کے مشترک مذہبی، اخلاقی، جمالیاتی اور فنی و علمی پہلوؤں کو اپنا لیتا ہو۔ [۳۳] ہرچند بعض لوگ، سیاست و اقتصاد، فرہنگ و ثقافت اور تربیت و حقوق جیسے اجتماعی نظام کے بڑے مجموعوں کو جو جغرافیائی لحاظ سے ایک بہت بڑی اکائی کے ایک وسیع و عریض حدود میں پھیلے ہوئے ہیں، تمدّن شمار کرتے ہیں۔[۳۴]

مغربی مفکرین کے ساتھ مستشرقین نے بھی تمدّن کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک الجزائری مفکر تمدّن کو اخلاقی اور مادّی اسباب و عوامل کا ایک مجموعہ خیال کرتا ہے جو ایک معاشرے کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ معاشرہ کی ہر ایک فرد کی ترقی و رشد کے لئے ضروری تعاون کرے۔[۳۵] ڈاکٹر شریعتی تمدّن کو انسانی

معاشرے کی معنوی اور مادّی تعمیرات و ذخائر کا ایک مجموعہ جانتے ہیں اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو طبیعت کی ساختہ و پرداختہ چیزوں کے مقابلے میں قرار دیتے ہیں۔[۳۶] اسی طرح افراد و اقوام کی مناسبتوں، لوگوں کی رفتار، ان کے علوم و فنون میں فکری آثار کے ظہور اور ایک فکر کی وسعت و فراخی اور سیر و حرکت کو بھی تمدّن سے عبارت جانا گیا ہے۔[۳۷] ابن خلدون تمدّن کو انسان کی اجتماعی حالت سے تعبیر کرتا ہے۔[۳۸] علامہ جعفری کے نزدیک تمدّن، ایک معاشرہ کے انسانوں کے روابط میں نظم و ہم آہنگی سے عبارت ہے جو ویران گر تصادم اور تنزاحم کا خاتمہ کرے اور رشد و کمال کی راہ میں سبقت کو اس ویران گر تصادم کا قائم مقام کرے، اس طرح سے کہ اس معاشرہ کے افراد کی اجتماعی زندگی اس کے تعمیری استعدادات کے ظہور اور فعلیت سے ہمکنار ہو۔[۳۹] بعض لوگ تمدّن کو ثقافت کی بلندی و برتری کا حاصل اور نظم اجتماعی کی قبولیت خیال کرتے ہیں، اور ابن خلدون کی بنیاد [شہر نشینی] پر تکیہ کرتے ہوئے عمرانیات پر تکیہ کرتے ہیں۔[۴۰]

اس کے علاوہ پچھلی کئی صدیوں میں انسانی گروہوں کی ایجادات و اختراعات اور فعالیتوں کی روشنی میں سافٹ ویر اور ہارڈ ویر جیسی ترقی یافتہ مصنوعات اور ذخائر کے مجموعے کو بھی تمدّن سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۴۱]

امام خمینیؒ کی نگاہ میں بھی جو تمدّن ظہور کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کو مادّی اور معنوی برتری کی طرف لے جانے کے لئے ضروری و لازم طاقت و توانائی سے بہرہ مند ہو۔ تمدّن ایسا ہو جو جوامع بشری کی فردی اور اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرے اور انسانوں کو ترقی و سربلندی عطا کرے۔[۴۲] کتاب ''صحیفۂ امام'' میں ہمیں نامہ نگاروں کے سوال کے جواب میں آپ کا ایک بیان ملتا ہے جو آج ہم سب کیلئے مشعل راہ ہے۔ نامہ نگاروں کے اس سوال کے جواب میں کہ ''شاہ آپ کو متہم کرتا ہے کہ آپ تمدّن کے مخالف اور رجعت پسند ہیں، آپ کا اس بارے میں کیا کہنا ہے؟ آپ نے جواب دیا: یہ خود شاہ ہے جو تمدّن کا مخالف اور رجعت پسند ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں سے میں اپنے اعلانات اور بیانات کے ذریعے شدت کے ساتھ اپنے ملک کی اجتماعی اور اقتصادی ترقی کا خواہاں رہا ہوں؛ لیکن شاہ سامراجی پالیسی پر گامزن ہے اور اسی سیاست کو نافذ کر رہا ہے۔[۴۳] ہم چاہتے ہیں کہ ایرانی قوم مغرب زدہ نہ ہو اور قومی اور مذہبی بنیادوں پر ترقی اور تمدّن کی طرف قدم آگے بڑھائے۔[۴۴] ہماری تحریک ایک متمدّن اور پیشرفتہ تحریک ہے۔[۴۵] کبھی امام خمینی نے تمدّن کے کلی معنی و مفہوم کو مدّ نظر رکھتے ہوئے فرمایا: اگر ہم مغرب کے اس فاسد اور مفسد تمدّن سے منھ موڑ لیں تو ہم رفتہ رفتہ خود کفیل ہو جائیں گے۔[۴۶] بلا شبہ ہم امام خمینی کے نظریات کا مطالعہ کرکے ضرور اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ ایک اخلاقی اسلامی تمدّن کی بنیاد اور تخلیق، مطلوب شارع مقدس ہے اور اس سے زیادہ واضح لفظوں میں عرض کروں کہ تمدّن کو اسلام اور اسلامیات سے پہلے بھی خود کو وصف اخلاقی سے متصف

کرنے کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا؛ کیونکہ ترقی دین کے اجتماعی اور فردی امور و معاملات میں بھی صرف انسانی اور عقلانی اخلاق کی شرط کے ساتھ قابل ترجیح ہوتی ہے۔

ان تعریفوں کی روشنی میں تمدّن کی چند خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں :

۱۔ تمدّن جیسا کہ لاطینی لفظ شہر نشینی یا شہری (civis) اور اس کی وصفی شکل (civilis) سے مشتق ہے، قانون پر مشتمل ایک اجتماعی نظام کی تشکیل کے لئے سازگار ہے۔

۲۔ کسی تمدّن کا دائرہ کار حکومت سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے اور طبیعتا اس کی عمر کسی خاص معاشرہ کی معاشرتی زندگی سے طولانی تر ہوتی ہے۔

۳۔ تمدّن کا ایک سخت پہلو ہے اور ایک نرم پہلو۔ اخلاق اور ثقافت کسی تمدّن کے نرم پہلو کے عنوان سے اس تمدّن کی بنیاد رکھتے ہیں جو یکساں طور پر اس کے تمام اجزاء کی نگرانی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک تمدّن کے عقلانی پہلو کی بازگشت اس کے اخلاقی پہلو کی طرف ہوتی ہے۔ اسی طرح سخت اوزاری پہلو بھی بشمول محصولات و مصنوعات تمدّن کی تعمیر کے لئے اخلاقی بنیاد کے ضمن میں ایک تمدّن کے سخت پہلو شمار ہوتے ہیں۔

۴۔ ہر تمدّن گوناگوں اجتماعی نظام جیسے سیاسی ،اقتصادی ، ثقافتی ،اخلاقی ،تربیتی اور اس کے علاوہ اور دوسرے چھوٹے اور بڑے نظام سے آراستہ ہوتا ہے اور یہ سارے نظام کسی خاص تمدّن کے تحت ہوتے ہیں جیسے انسانی اور اسلامی اخلاقی نظام۔

۵۔ ایک تمدّن کی تشکیل بلا شبہ اجتماعی یا پھر اخلاقی نظاموں کے درمیان ہم آہنگی کا نتیجہ ہے ؛اور اس ضروری اصل کے فقدان کی صورت میں کبھی کوئی تمدّن وجود میں نہیں آسکتا ہے۔

اسلامی تمدّن

اسلامی تمدّن ، مسلم اقوام کے درمیان مشترک آداب ورسوم کا مجموعہ ہے، البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چونکہ یہ تمدّن اسلام کے نام سے موسوم ہے اس لئے اس کے تمام مظاہر قرآن وسنّت سے مأخوذ ہیں اور اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے ؛اور یہی چیز تمدّن کو حکم شرعی سے جدا اور علیحدہ کرتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر چند مرور زمانہ سے تمدّن کے مظاہر میں تبدیلی آجائے پھر بھی اس کو اسلامی تمدّن کہنا چاہئے۔ تمدّن عصر چاپاری اسلامی تمدّن تھا، ماہوارہ وانٹرنیٹ کے دور کا تمدّن ، وہ بھی اسلامی تمدّن ہے۔[۴۷] یہ قول جو ڈاکٹر سید جعفر شہیدی

کے نظریات سے مأخوذ ہے، وہی مبدأ و محل پیدائش ہے جس کو ہم زندہ کرنے کے فراق میں ہیں، اور اس کو عقلانیت سے تعبیر کرتے ہیں، جس کا ظہور اخلاق انسانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسلامی تمدّن ان آثار اور تولیدات کا مجموعہ ہے جو جزیرۃالعرب میں دین مبین اسلام کی پیدائش اور دوسری سرزمینوں کے لوگوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد وجود میں آیا، جس کا نقطۂ آغاز شام اور نقطۂ بالیدگی بغداد ہے۔ یہ تمدّن تاسیسی، تملیکی اور تقلیدی عناصر سے مرکب اور ان کا مجموعہ تھا۔[۴۸] پیغمبر ﷺ کے نوبنیاد شہر مدینہ النبی میں ایک منتخب موجود کے عنوان سے ایک شخص مقام خلیفۃاللہی پر فائز ہو کر سنگین وظائف کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھاتا ہے اور قرب الی اللہ اور رضائے پروردگار تک پہونچنے کی جستجو میں قوانین الٰہی اور سنّت نبوی کا دامن تھام کر ترقی و رشد کے تمام مراحل کو طے کرتا ہے۔[۴۹] کسی انسان کا اس راہ کو طے کرنا اخلاق کا دامن تھامے بغیر ممکن نہیں ہے؛ کیونکہ انسان علم و دانش کے میدان میں چاہے جتنی کامیابیاں حاصل کرلے، اگر اخلاق کی محوریت کا قائل نہیں ہوگا تو انحطاط کا شکار ضرور ہوگا اور پستی اس کا مقدر بن جائے گی۔

فقہ اور تمدّن کا تقابلی مطالعہ

ایک گروہ، فقہ و تمدّن کے درمیان رابطے کی نفی کرتا ہے اور معتقد ہے کہ تمدّن اور اجتماعی سرپرستی اور مقولۂ فقہ یہ دونوں مقولے بالکل بیگانہ اور اجنبی ہے۔ یہ گروہ تمدّن کو عہدہ دارِ معیشت اور فقہ کو عہدہ دارِ سعادت جانتا ہے۔ اس گروہ کے نقطۂ نظر سے اگر فقہ، معیشت کے کسی شعبے میں دخل اندازی کرے تو دخالت عرضی ہوگی اور حقیقی پہلو سے بالکل عاری ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں فقہ کا تمدّنی اظہارِ نظر بالعرض ہے اور حقیقت میں فقہ نے اپنے موضوع سے ہٹ کر گفتگو کی ہے۔[۵۰؛۵۱][۵۲] ہر چند بعض لوگ اس نقطۂ نظر کو مغرب کی پیداوار اور وارداتی کہتے ہیں۔[۵۳] اس بیچ ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جو سعادت اور دیانت کے درمیان کسی بھی تعلق اور رابطہ کی نفی کرتا ہے اور معتقد ہے کہ سعادت تک پہونچنے کے لئے انسان کا واحد راستہ معیشت ہے اور وہ بھی عقلِ جمعی اور عقلِ بشری کے ذریعے قابل دستیابی ہے۔[۵۴] لیکن ہماری گفتگو اور بحث کا موضوع وہ مسلم مفکرین اور دانشور حضرات ہیں جو شریعت کو مانتے ہیں، لیکن مقولۂ سعادت کے لئے اس کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں اور سعادت و دیانت کے درمیان کسی بھی رابطہ کے منکر ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے طرفداروں کا ماننا ہے کہ فقہ و سیاست دونوں لازم و ملزوم ہیں اور مقولۂ تمدّن اور مقولۂ معیشت بھی بہم مخلوط ہیں اگرچہ ان دونوں کا میدان بالکل جدا اور مستقل ہے۔ سعادت فقہ کے ذمہ ہے اور معیشت تمدّن کے ذمہ ہے۔ تمدّن انسانوں کے عقل کی پیداوار ہے۔ یعنی روش و آئین اجتماعی اور معاشرہ کی رہبری، معیشتی اور اجتماعی امور میں ہے جو بطور استقلال عقلِ بشری سے نمو اور رشد حاصل کرتی ہے۔[۵۵]

ایک دوسرا گروہ، فقہ و تمدّن کے درمیان ارتباط کلّی کو مدّ نظر رکھتا ہے اور ان دونوں کے درمیان کمترین نسبت کا قائل ہے۔ یہ گروہ معیشت و فقہ کے ارتباط کو تسلیم کرتا ہے لیکن تمدّنی برنامہ ریزی، اجتماعی زندگی کی ہدایت اور معیشت کو پروان چڑھانے میں فقہ کے لئے کسی رول کا قائل نہیں ہے۔ یعنی یہ تو مانتا ہے کہ فقہ نظارتی پہلو رکھتا ہے لیکن فقہ کی مدیریت اور برنامہ ریزی والے رخ کا قائل نہیں ہے۔ اس گروہ کا ماننا ہے کہ انسان خداداد توانائیوں اور صلاحیتوں منجملہ عقل، تجربہ، عقل جمعی اور انسانی افکار و نظریات کی مدد سے تمدّن سازی کر سکتا ہے اور ادارۂ معیشت کی توانائی سے بہرہ مند ہو۔ فقط ممکن ہے انتخابی راہ و روش اور سعادت معنوی و اخروی میں تعارض ہو کہ ایسی صورت میں لازم ہے فقہ اپنا کام کرے اور اپنے نظارتی رول کو بخوبی ادا کرے اور اس کی تصحیح کرے۔[۵۶]

کچھ لوگ مقولۂ تمدّن سازی میں فقہ کی زیادہ شراکت کے قائل ہیں اور فقہ کو معیشت کے پروان چڑھنے کا ضامن اور ذمہ دار جانتے ہیں۔[۵۷] اس بیچ روایتی اور سنتی فقہ کے طرفدار موجودہ فقہ کی توانائی کو تمدّن سازی کی زمین کی زرخیزی کے لئے کافی جانتے ہیں۔ دوسری طرف ایک گروہ ایک قیمتی ورثہ کے طور پر فقہ تشیع کی حفاظت و حراست پر زور دیتے ہوئے موجودہ فقہ کو تمدّن ساز پالیسی سے محروم سمجھتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر، موجودہ فقہ پر حاکم نقطۂ نظر کو انفرادیّت پر زیادہ توجہ دینے والا قلمداد کرتا ہے نیز یہ سمجھتا ہے کہ اس میں اجتماعی تبدیلی کے طریقۂ کار کا فقدان ہے۔ یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ فقہ کی تبدیلی اور اس کے ارتقاء میں عنصر حکومت کا ذکر کرتا ہے اور فقہ حکومتی کے عنوان سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

تمدّن سازی میں ظن عقلائی کی اخلاقی کارکردگی کے تعلق سے ایک تحقیق

بعض معاصر محققین[۵۸] معتقد ہیں کہ تمام شیعہ مفکرین، وجود شناسی کے لحاظ سے اخلاق کی سیکولریت یا دین سے اخلاق کی جدائی و استقلال نیز دین و اخلاق کے تلازم کے قائل ہوئے ہیں۔ ان مفکرین کی نگاہ میں اخلاقی احکام مستقلات عقلیہ کا ایک حصہ ہیں۔ یعنی اخلاقی قضایا کا شمار ان قضایا میں ہوتا ہے جو عقلاء اپنے کشف و اعتبار میں عقل و شرع کے محتاج نہیں ہیں اور دینی متون سے حاصل شدہ اخلاقی احکامات اور سفارشات، حکم عقل یا وجدان عقلاء کی رہنمائی سے عبارت ہیں۔ تمام شیعہ مفکرین نوعی اعتبار سے فقہ پر اخلاق کے تقدّم کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس اصل سے ایک اصولی یا فقہی قاعدہ کے عنوان سے حکم شرعی کو معلوم کرنے، یا اس کی توجیہ کرنے، اپنی فہم و درک کی تصحیح اور دینی متون سے استنتاج کرنے کے لئے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ ان مفکرین [۵۹] کی نظر میں حکم کا اعتبار اور اس کی حجیت یا عقل کا ادراک اس بات سے مشروط ہے کہ حکم یا عقل کا ادراک، یقینی اور قطعی ہو کیونکہ ان کی نگاہ میں ظنون عقلیہ اور عقلائیہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یعنی اس کو بالکل بھی معتبر نہیں جانتے ہیں۔اسی وجہ سے اخلاقی اقدار اور یہ کہ اخلاقی اعتبار سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط، نیز عقلائی روش اور قرارداد، یہ تمام چیزیں دینی متون کے ظواہر سے تعارض اور ٹکراؤ کی صورت میں درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ جبکہ دینی متون کا ظاہر، ظنون عقلانی اور عقلائیہ سے تعارض کی صورت میں اپنی حجیت اور اعتبار پر باقی رہتا ہے۔ان مفکرین کی نگاہ میں دینی متون کے ظاہر کی حجیت اور اعتبار نیز خبر واحد ثقہ کی حجیت اور اعتبار قطعی طور پر ثابت ہے، جبکہ ظنون عقلی اور عقلائی یا کلی طور پر فاقد الاعتبار ہیں یا ان کا اعتبار کسی مورد سے مخصوص ہے جہاں ظن یا کوئی نقلی معتبر دلیل موجود نہ ہو۔ [۶۰]

دوسرے لفظوں میں ظنون عقلائی کی قدر و قیمت کی بات جو سعی و کوشش سے جدید تمدّن کی اخلاقی زمین میں تبدیل ہو سکتی ہے، وہ عرف اور ماہر عقلاء کے نظریہ کی غیر عرف اور غیر ماہر عقلاء کے نظریہ پر ترجیح کی بات ہے۔یعنی عقل شورائی اور عقل جمعی کی اپنے ہم نوعوں پر برتری جو ذاتی طور پر اور بعض اوقات غیر تخصّصی اور غیر مقبول اور انتزاعی خبر واحد کے تعبد سے مشروط اور فہم فردی پر موقوف ہوتی ہے، بشر کی خدا پر ترجیح کی بات نہیں ہے۔

سیرۂ عقلاء معاشرۂ انسانی کی عقلانیت کی حد اور مقدار کو بیان کرتی ہے اور رہ یہ روش انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتی اور حقوق بشر کے مبنی کی کمترین سطحِ طاقت ہے۔شریعت لوگوں کو افعالِ عقلائی کی دعوت دیتی ہے، نہ کہ عقل کو شرع کا قائم مقام سمجھا جائے، دلائل کے اعتبار کو جانچنے اور پرکھنے میں جب نظریۂ عرفی عقلائی حاکم ہو تو یہی نظریۂ عقلائی حکم کرتا ہے کہ ظنِّ معتبر، علم کا ہم طراز اور ہم پلہ ہے اور اس کے مقابلے میں موجود احتمالِ خلاف کی کوئی علمی حیثیت و وقعت نہ ہوگی۔[۶۱؛۶۲]

اس بنیاد پر ایک اخلاقی نگاہ کے لئے جدید اسلامی تمدّن کی تشکیل میں علامت گزاری کی ضرورت پہلے سے زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے۔امام خمینیؒ اس باب میں مذہب و قانون کے سامنے خضوع و خشوع اور تصویب ناموں کے مقابلے تجدید نظر اور مذہب و قانون کے سامنے تسلیم ہونے کو شہامت و شجاعت اور تمدّن کی علامت جانتے ہیں۔[۶۳] اسی طرح تمدّن سازی کے شعبے میں گروہ بندی اور فرقہ سازی کی اہمیت پر آپ کی تاکید، مدنی آزادی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔[۶۴] امام خمینیؒ کے صریح بیان کی روشنی میں متمدّن مملکت وہ ہے جو آزاد و خود مختار ہو اور اس کے مطبوعات، اظہارِ عقائد اور اپنی رفتار میں آزاد ہوں۔[۶۵] مغربی تمدّن کے مقابلے لفظِ

آزادی کے استعمال کے تعلق سے مثالی اخلاقی اہتمام کے ساتھ آپ کا عقیدہ ہے کہ اسلام تمدّن کے تمام آثار کا موافق ہے اور چاہتا ہے کہ اسلامی سلطنت تمدّن کے تمام آثار سے آراستہ ہو۔[۶۶]اسی وجہ سے امام خمینی مغربی تمدّن کے مثبت پہلوؤں پر بھی زور دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ غرب والے خوبیوں کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل ہیں۔[۶۷] مغربی تمدّن کا سب سے اہم پہلو آپ کی نظر میں ٹکنالوجی اور علم وصنعت ہے اور اس کی پذیرائی پر کافی زور دیتے ہیں۔[۶۸]امام خمینی کی نظر میں اسلام علم اور کسی بھی علم و فن میں مہارت کی قدردانی کرتا ہے اور مسلمانوں کو علم آموزی کی دعوت دیتا ہے اور ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر علم کافروں کے پاس بھی ہو تو جاؤ اور ان سے اس علم کو حاصل کرو۔{۶۹} امام خمینی کی نظر میں تمدن و تجدد کے تمام آثار مجاز ہیں۔{۷۰} اسی وجہ سے طریقیت میں امام خمینی غرب کے سیاسی مکتب فقہ سے استفادہ کرتے ہیں اور فقہ سیاسی کے مصلحتی عنصر سے زیادہ سے زیادہ استفاد کرنے پر زور دیتے ہیں۔ہر چند امام خمینی کی نگاہ میں معنویت سے دوری{۷۱}اور استعماری طرز فکر{۷۲} مستقبل قریب میں مغربی تمدّن کے خاتمہ کی زمین فراہم کرے گا۔امام خمینی کی نگاہ میں تمدّن اس رخ سے اخلاقی اور مفید قید آزادی ہے جب انسان کی تعریف تمام مادّی اور معنوی پہلوؤں کے ہمراہ اس تمدّن کی محوریت میں کی جائے۔[۷۳]

بنابراین، اخلاقی فضا میں سانس لینے کی ضرورت کی بنیاد پر منصفانہ علمی روشِ تنقید کے ہمراہ جدید اسلامی تمدّن کی تشکیل کی راہ میں فقہی حاکمیت کا بعض ناقابل تبدیل اخلاقی اصولوں سے اتّصاف پہلے سے کہیں زیادہ تحقیق کا طلبگار ہے، جن کی طرف ایک اشارہ کیا جارہا ہے۔{۷۳}

تمدّن ساز آزادی

شائد کہا جاسکے کہ آزادی، فقہِ سیاسی شیعہ اور جہان اسلام میں جدید تمدّن کی تشکیل میں تحلیل و تحقّق حق کے لئے ایک اہم ترین مفہوم ہے۔اسلامی نقطۂ نگاہ سے آزادی کے تین مختلف اور بہم مربوط مفہوم معین و مشخص کئے جاسکتے ہیں۔یہ تینوں مفاہیم درج ذیل ہیں:

۱۔اعتقادی آزادی

۲۔اخلاقی آزادی

۳۔ فقہی آزادی۔[۷۴]

اعتقادی آزادی کا مفہوم، انسان کی ماہیت اور اس کے اختیار کے وجود شناسانہ ادراک سے پیدا ہوتا ہے۔ شیعہ اعتقادی لحاظ سے عدلیہ کا جزء ہیں اور عدلیہ جبر و اختیار کی جنگ میں اختیار کے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ اس طرح سے عدل الٰہی کی قبولیت ایک شیعہ کو مجبور کرتی ہے کہ وہ آزادی کو تسلیم کرے۔[۷۵]

آزادی کے اخلاقی مفہوم کی بھی منابع شیعہ میں ایک خاص مرتبہ اور اہمیت ہے۔ایک اخلاقی روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :"خَمْسُ خصالٍ مَنْ لَمْ تَكُنْ فِيهِ خَصلةٌ مِنهَا فَلَيْسَ فِيْهِ كَثِيْرُ مُسْتَمْتَعٍ ،اَوّلَهَا :اَلوَفَاءُ ،وَالثّانيةُ :التَدْبِيْرُ ،وَالثالثةُ :اَلْحَيَاءُ ،وَالرابعةُ :حُسْنُ الخُلُقِ ،وَالخَامِسَةُ :وَهِيَ تَجْمَعُ هذهِ الخصالُ ،الحُريةُ "آزادی اور حریت کے بلند و بالا مقام و مرتبہ کے لحاظ سے یہ امام علیہ السلام کا بہت ہی بے بدیل بیان ہے:" پانچ صفتیں ایسی ہیں کہ اگر کسی شخص میں ان میں سے صرف ایک صفت نہ ہو تو ایسا شخص بہت زیادہ فائدہ سے محروم ہے؛ وفا، تدبیر، حیاء، خلق حسن اور آزادی۔ یہ پانچویں صفت ایسی ہے جو سب کو حاوی اور شامل ہے۔[۷۶] اسی طرح ایک مقام پر امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں :"وَلَا تَكُنْ عبدَ غَيرِكَ وَقَد جَعَلَكَ اللهُ عَبْداً حُرّاً "کسی غیر کے بندے نہ بنو کیونکہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔[۷۷]

بنابراین ،لوگوں سے ان کی آزادی کو جس کا ذکر اسلام نے کیا ہے اور انسان کی زندگی کی اولین ضرورت ہے،اسے چھینا نہیں جاسکتا۔ حقیقتاً مسلمان آدمی اپنی زندگی کے تمام شئون و حالات میں اور تمام اسلامی ممالک میں آزاد ہے؛ غرضکہ سفر و حضر، زراعت و تجارت، عمرانیات، کسب وکار، کتب و مقالات اور ،مجلّات و اخبار کی نشرواشاعت؛ تاسیس احزاب، تالیف و تصنیف، خطابت وکتابت ،انتخاب خانہ وکاشانہ اور انتخاب ہمسر وغیرہ ہر چیز میں آزاد ہے۔ کلی طور پر انسان محرمات شرعی کو چھوڑ کر تمام اجتماعی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں میں آزاد ہے اور کسی کو بھی حق نہیں پہونچتا کہ وہ ان تمام امور میں اس پر کسی بھی قسم کی پابندی عائد کرے۔[۷۸]

لسانِ فقہ شیعہ میں آزادی کے فقہی مفہوم کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ،اوّل: آزادی بمنزلۂ امارہ ہے جو منابع شیعہ میں عموماتِ حریت سے پیدا ہوتی ہے اور دوّم: آزادی بمنزلۂ اصل ہے جو آزادی یا عدم آزادی پر دلیل نہ ہونے کی صورت میں جاری ہوتی ہے۔ مرحوم آیت اللہ گلپائگانی (۱۴۱۴ھ) آزادی کی ان دونوں تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں :" ... کیونکہ اصالتِ آزادی دو حالت سے خالی نہیں ہے، یا عام اور امارہ ہے جیسا کہ یہی مفہوم حق اور صحیح لگتا ہے یا ایک اصل ہے جو بلحاظ حالت شک جاری ہوتی ہے۔ لیکن تفسیر اوّل کی بنیاد پر دیگر

عمومات شرعی کی طرح اصالتِ برائت ایک عام اور کلی قاعدہ ہے۔اس ترتیب سے اور ایک قاعدہ کے عنوان سے ہر انسان آزاد ہے اور خداوند عالم نے کسی کو غیر آزاد خلق نہیں کیا ہے؛مگر یہ کہ کوئی چیز عارض ہو اور اس سے سلبِ آزادی کا باعث ہو۔" [۷۹]کچھ دوسرے فقہاء شیعہ نے بھی آزادی کو بمنزلۂ اصل جانا ہے اور عقل عملی کے مرجع کے طور پر اس کی تفسیر و وضاحت کی ہے جو حالت شک میں جاری ہوتی ہے۔" اَلاَصْلُ الحُرِّیَّۃُ وَعَدَمُ الوَلَاءِ فَاِثبَاتُھُما یَحْتَاجُ اِلیٰ دَلَالَۃٍ "[۸۰]اس امر میں غور و خوض اور تحقیق و تفحص کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی کے بارے میں عقل اور عموماتِ شرعی کے مفاد کے درمیان مطابقت کے پیش نظر اصالتِ حریت کے باب میں عقل و شرع اور اصل و قاعدہ اس طرح آپس میں دست و گریباں ہیں کہ ان کے درمیان تفکیک اور تمایز کا کوئی عملی و استنباطی، نتیجہ اور فائدہ نہیں ہے۔شائد اسی وجہ سے بہت سارے فقہاء نے جزئی امور پر توجہ نہیں دی اور آزادی پر تکیہ کرتے ہوئے بمنزلۂ اصلِ موضوعی، فقہ سیاسی میں اس کے لوازم کی تحلیل پر اپنی پوری قوت صرف کی ہے۔بعنوان مثال کہا جاتا ہے "اصل، انسان کی آزادی ہے اور رای اور تدبیر کی آزادی کا سرچشمہ وہی انسان کی آزادی ہے۔ "اَلاَصْلُ حُرِّیَّۃُ الاِنْسَانِ ، اَلَّذِیْ یَتَشَعَّبُ مِنْہُ حُرِّیَّۃُ الرَّایِ وَالتَّدْبِیْرِ " [۸۱] سید محمد باقر الصدرؒ بھی بہت سارے سیاسی اجتماعی اور اخلاقی حقوق کے مبنی کے طور پر آزادی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: "فَالْحُرِّیَّۃُ بِاَشْکَالِھَا الْمُتَنوِّعَۃِ ، ھِیَ الْاَسَاسُ الَّذِی تُنْبَثِقُ مِنْہ کُلُّ الْحُقُوقِ وَالْقِیَمِ الْمَذْھَبِیَّۃِ " بنابراین،آزادی اپنی تمام شکلوں کے ساتھ وہی اساس اور بنیاد ہے جو تمام حقوق اور مذہبی اقدار کا سرچشمہ ہے۔[۸۲]

امام خمینیؒ اس بات کے ضمن میں کہ اسلام کی ڈیموکریسی غرب کی ڈیموکریسی سے زیادہ کامل واکمل ہے ، [۸۳] معتقد ہیں کہ اسلام کا قانون، حقیقی آزادی اور ڈیموکریسی کا پیش خیمہ ہے اور ملکی استقلال کا بھی ضامن ہے۔ [۸۴]اسی طرح امام خمینی کے نظریہ کے مطابق،آزادی کو انسان کے حقوقِ اوّلیہ میں سے شمار کیا گیا ہے اور آپ ایک طرح سے انسان کے بنیادی اور ابتدائی حقوق کا عقیدہ رکھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ آزادی، انسان کا بنیادی اور اوّلین حق ہے۔استقلال اور آزادی دو چیزیں ہیں جو بشر کے ابتدائی حقوق میں شمار ہوتی ہیں۔[۸۵] یہ انسان کا بنیادی اور اولین حق ہے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور آزادی گفتار کا طلبگار ہے۔[۸۶] یہ سب اس وجہ سے ہے کہ امام خمینی آزادی کو خدا کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں جو انسان کو خدا نے عطا کی ہے اور اس کو آدمی کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔[۸۷امام خمینی زندگی کی قدر و قیمت کو استقلال و آزادی سے وابستہ جانتے ہیں {۸۸} یعنی

آپ کی نگاہ میں زندگی کی قدر و قیمت اسی وقت ہے جب آدمی آزاد اور مستقل ہو اور کسی کے رحم و کرم پر نہ ہو۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ اسلامی جمہوریت میں ہر طرح کی آزادی ہے۔

امام خمینیؒ کی ان باتوں سے شائد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ :اوّل: اسلام میں ڈیموکریسی پائی جاتی ہے ؛دوّم: اسلام کی ڈیموکریسی غرب کی ڈیموکریسی سے کامل تر ہے ؛سوّم : یہ اسلام کا قانون ہے جو حقیقی آزادی اور ڈیموکریسی کا تحفہ پیش کرتا ہے ؛ چہارم: اسلامی آزادی اور ڈیموکریسی ملکی استقلال کی ضامن ہے۔البتہ ایسا لگتا ہے فقہی حاکمیت کی روشنی میں نظریۂ اخلاق سیاسی کو اور زیادہ نشو ونما پانے کی ضرورت ہے اور اخلاقی عاقلانہ تظنّن ہمارے لئے ایک اور ہموار راستہ پیدا کرتا ہے۔

مدارات اور تمدّن سازی

جہان اسلام میں جدید تمدّن کی تشکیل کے لئے اس تناظر میں ایک دوسری ناقابل تبدیل انسانی اخلاقی اور شرعی اصل جس پر اخلاقی گفتگو میں کافی زور دیا جاتا ہے ،اصلِ مدارات ہے۔مدارات کا شمار رفتار اجتماعی اور فقہ حکومتی میں ایک مثبت روش کے طور پر ہوتا ہے۔ایک پسندیدہ روش اور منش جو بشر کے عمومی تمدّن میں کافی پہلے سے رائج اور سننے میں آتی ہے، حکماء اس کو حکمت عملی سے تعبیر کرتے ہیں [۸۹] کیونکہ بشری عقل و منطق اس کی دعوت دیتی ہے اور انبیاء الٰہی نے اس کی تائید و توثیق کی ہے اور اس بات پر بہت زیادہ زور دیا ہے تاکہ خوشنودی خدا کے ثانوی محرک کو اصلی محرک یعنی "مقتضائے عقل و منطق" کے پہلو میں قرار دیں اور اس کے تحقّق میں مددگار ہوں۔ایک صحیح روایت میں امام صادق علیہ السلام پیغمبر ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا :" اَمَرَنِی رَبِّی بِمُدارَاةِ النَّاسِ کَمَا اَمَرَنِی بِاَلْفَرائِضِ "[۹۰]ایک دوسری روایت بھی پیغمبر سے منقول ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ " اُمِرْتُ بِمُدَارَاةِ النَّاسِ کَمَا اُمِرْتُ بِتَبْلِیْغِ الرِّسَالَةِ "[۹۱] حضرت ختمی مرتبت کے بیان حق ترجمان میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ تبلیغ رسالت ،نوع بشر کے ساتھ مدارات کے ہم پلہ اور ہم عرض ہے اور اس کو مدارات کے طول میں نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس حدیثِ مبارک میں پیغمبر خدا ﷺ کے دوگانہ وظائف و فرائض کا ذکر موجود ہے،فریضۂ تبلیغ رسالت اور فریضۂ مدارات۔اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اصل شریعت محمدیؐ کی ایک کلّی اور بنیادی اصل ہے۔

فردی اور اجتماعی اخلاق میں سیاسی فقہ کی حکمرانی کے تعلق سے تحقّقِ مدارات کے اخلاقی عناوین درج ذیل ہیں :

تواضع و فروتنی ،انصاف ، عدالت ،افراط و تفریط سے پرہیز [1]برقراری توازن ،غیر علم کی پیروی نہ کرنا [2]، حلم، تغافل ، رفق ، صبر ، کرم،ایثار وغیرہ ۔اس بارے میں مدارات پر منتج اخلاق انسانی کے حوالے سے شریعت کاتائیدی طرز عمل قابل تردید نہیں ہے۔ مولائے متقیان علی علیہ السلام فرماتے ہیں :'' اِنَّ الْعَاقِلَ نِصْفَه تَغَافُلٌ وَنِصْفُه اِحْتِمَالٌ '' [۹۲] خردمند شخص دو چیزوں میں خلاصہ ہوتا ہے ؛نصف تغافل اور نصف بردباری۔ یعنی عقلمند انسان کو چاہئے کہ وہ تغافل سے کام لے اور بردباری پیشہ کرے۔ یہ روایت قطعی طور پر مؤمنین کے اخلاق کے اجتماعی پہلو کی نشان دہی کرتی ہے جو سیاسی اخلاق میں بھی قابل ملاحظہ ظہور رکھتی ہے۔امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :سب سے زیادہ عقلمند وہ شخص ہے جو انسان کے ساتھ سب سے زیادہ مدارات اور رواداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔[۹۳]مدارات ، حکمرانی میں کوئی وقتی ٹکنیک نہیں ہے؛بلکہ ایک عقلی اصل اور دائمی حکمت عملی ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ قابل عمل ہے۔بہت ساری روایات [3]میں اہلبیت علیہم السلام کی حکومت میں بھی ضرورت مدارات پر کافی زور دیا گیا ہے۔یعنی اوج حکمرانی اسلام میں بھی مداراتی تقیہ موجود ہے۔ [4]

بنابراین، اسلام کی بنیادی اجرائی سیاست مداراتی تقیہ پر مبنی ہے اور اس سے مراد شرعی افکار و نظریات اور تجاویز وتدابیر کو تحمل وبرداشت کرنے کے لئے فکر بشر کو تحمل کرنے کی رعایت کرنا ہے۔ خواہ حکم شرعی ہو یا روائی۔ اسی وجہ سے شرعی افکار و نظریات اور تدابیر کی جانب انسانوں کو رغبت دلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی دانشمندوں اور اہل شریعت کا اصلی وظیفہ دین وشریعت کے حقائق کی اس طرح تبیین اور وضاحت کرنا ہے کہ عقلائے عالم اور متفکرین جہان ،شرعی افکار و نظریات کی طرف راغب اور مائل ہوں ۔بشری عقلانیت سے لاتعلّقی کے

۱۔ حدیث ''لاَ تَرٰی الجَاهِلَ الا مُفْرِطاً اور مُفَرطاً ''کی طرف اشارہ ہے۔[۹۴]

۲۔ آیہ۔ ''لَاتَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْم '' کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ نمونہ کیلئے رجوع کیجئے۔ [۹۶] کی طرف

۴۔ مداراتی تقیہ ایک سیاسی۔ اجتماعی روش ہے جو نظم اجتماعی کو دیکھتی ہے اور اہل ایمان کی ذمہ داری کے تعلق سے حکم فقہی ہر اس انسان کے ساتھ جو صلح وہم زیستی کو ترجیح دیتا ہے اور ماجراجوئی کے لئے دوسروں کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالتا ہے، ایک مسالمت آمیز زندگی گزارنے کے لئے ہے۔ بلکہ ایک مدبرانہ روش ہے جو خانماں سوز بشری ٹکراؤ کو روکنے کے لئے وجود میں آئی ہے اور اہل خشونت کے مقابلے ایک منطقی رد عمل کو ضروری سمجھتی ہے تاکہ دشمنی کے بے شمار نقصانات کو کم کرے اور معقول و منطقی روش کو اپناتے ہوئے فساد کی روک تھام کرے۔

ساتھ دفاع شریعت ،احکام شرعی کے نفاذ کی ضرورت اور شریعت کے نام پر غیر منطقی افکار و نظریات کے نفاذ کا دعوی فقط یہی کام کرتا ہے کہ دنیا والوں کے عمومی افکار کو دین و شریعت سے برگشتہ اور منحرف کر دیتا ہے اور دین وشریعت سے ان کی دوری کی بنیادی وجہ یہی چیز بنتی ہے۔

شہید مطہریؒ اس بارے میں فرماتے ہیں "کسی بھی فقیہ کو اس کبرائے کلی میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر چھوٹی مصلحت کو نظر انداز کر دینا چاہئے اور بڑے مفسدہ کی خاطر جو اسلام کو درپیش ہے چھوٹے مفسدہ کو برداشت کر لینا چاہئے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فقیہِ وقت مصلحتوں کو تشخیص نہیں دیتا، یا مصلحتوں کو تشخیص تو دیتا ہے لیکن لوگوں سے ڈرتا ہے اور جرائت گفتار سے کام نہیں لیتا اور اس صورت میں بھی اسلام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ساری غلطی فقیہ کی ہے جو اس نے بزدلی دکھائی ہے اور جرأت سے کام نہیں لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقیہ میں جو جرائت و شہامت ہونی چاہئے وہ اس میں نہیں ہے۔[۹۸]

سیاسی اطاعت جو قہر و غلبہ اور تسلط کا نتیجہ ہوتی ہے اور دل سے نہیں ہوتی وہ نفاق اور خیانت کو جنم دیتی ہے۔ صفتِ مدارات معاشرے کے تمام قوائے ظاہری اور قوائے باطنی کو رام اور دلوں کو فتح کرتی ہے اور فتحِ قلوب سے فتحِ ممالک کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔[۹۹] امام خمینیؒ کی نگاہ میں اسلام زمین پر اپنے تسلط کا قائل نہیں ہے بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا چاہتا ہے اور دلوں کو فتح کرنا اور قلوب پر حکومت کرنا خشونت، اقتدار طلبی اور ظلم و استبداد سے ممکن نہیں ہے۔[۱۰۰] ڈیموکریسی اور استبدادی نظام حکومت کے درمیان وجہِ امتیاز، سیاسی تساہل اور عدم تساہل ۱۰۱] خشونت و درندگی ،لوگوں کے حقوق اور آزادی کی رعایت نہ کرنا اور قہر و غلبہ کی بالادستی ہے۔[۱۰۲] طاغوتی حکومت کے برخلاف اسلامی حکومت کی فضا، محبت، رواداری، عدل و انصاف ،امن وامان ،اور آرام و آسائش کی فضا ہے۔[۱۰۳] اسلامی حکومت میں شہریوں کو رعب و وحشت کے زیر سایہ زندگی نہیں گزارنی پڑتی ہے، بشرطیکہ واقعی اسلامی حکومت ہو، نام کی اسلامی حکومت نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں امام خمینیؒ کی نگاہ میں اسلام کا سیاسی نظام، فضیلت محور ہے اور اس کے دائرے میں تمام انسان قابل احترام ہیں۔ صدر اسلام میں کوئی بھی شہری اور باشندہ پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت امیر علیہ السلام سے نہیں ڈرتا تھا باوجودیکہ آپ ایک وسیع و عریض مملکت کے رئیس تھے۔[۱۰۴] مدارات کو سیاسی اور اجتماعی معاشرہ پذیری کی ضرورت ہے۔ ایک اقتدار طلب اور استبداد زدہ نظام میں صفت مدارات کبھی پروان نہیں چڑھتی ہے بلکہ معاشرے میں دو دوسری چیزوں یعنی بے تفاوتی، تبعیض اور خشونت و سفّاکیت کا راج ہوتا ہے۔ صفت ادارات ایسے معاشرے میں پروان چڑھتی ہے جہاں مدنی، سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، ثقافتی اور قومی آزادی کو مختلف افکار و

عقائد رکھنے کی وجہ سے برسر اقتدار حکومت سے کوئی خطرہ نہ ہو اور کسی کا حق پائمال نہ ہو؛یعنی کسی کا حق پائمال ہو اور نہ کسی کی آزادی پر حرف آئے اور سلیقوں اور عقائد کا اختلاف شہریوں کے حقوق کی رعایت کی راہ میں مانع اور رکاوٹ نہ بنے۔آج کل سماج اور معاشرے میں سیاسی واجتماعی تصادم بہت زیادہ اور ایک رائج امر ہے ۔جس طرف دیکھو نامساوات کا بازار گرم ہے اور متضاد افکار وعقائد کی وجہ سے لوگ آپس میں دست و گریباں ہیں۔علاوہ اس کے حکومت کی خشونت آمیز روش اور اس کا جانبدارانہ رویہ اس کے لئے اور زیادہ زمین ہموار کرتا ہے اور اس کو مزید شعلہ ور کرتا ہے۔[۱۰۵

خلاصہ

اسلام نے اصلِ خاتمیت کے مبنیٰ پر اپنی سیاسی رفتار کے تعلق کو جہان شمولی قید سے وابستہ جانا ہے، یعنی اس کے احکامات اور دستورات کچھ اس طرح تنظیم ہوئے ہیں کہ لوگ اس کے کلی اصولوں کی طرف رجوع کرکے اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کی سعادت کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔یہ راہ جو اجتماعی سطح پر مکمل طور پر صرف اسلامی تمدّن کی تشکیل کی راہ سے گزرتی ہے، فقہ حکومتی کی صورت میں اسلام کے سیاسی طرز عمل کی بدولت دنیا والوں کے سامنے اسلامی حاکمیت کا ایک نیا چہرہ پیش کرتی ہے ۔ فقہ شیعہ کی نگاہ کا مرکز اپنی اجتماعی کارکردگی کی روشنی میں پوری دنیا میں ایک تمدّن کی تشکیل ہے جس کو اسلامی تمدّن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظنّ خاص کے مبنیٰ پر ظہور یافتہ اخبار وروایات پر موقوف اتصافی نگاہ کی بدولت اسلام کے سیاسی طرز عمل میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں اور یہ چیز اسلامی تمدّن کے جہان شمولی ہونے کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے؛یعنی اس تحقیق کا نتیجہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہم صرف خبر واحد کے مبنیٰ پر تکیہ کرتے ہوئے جو کہ ہمارے زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے نہ عالمی معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں اور نہ جدید اسلامی تمدّن کی تشکیل کی راہ میں قدم آگے بڑھا سکتے ہیں۔دوسری جانب ہمیں ایک جہان شمول معیار کو فقہی تمدّن سازی کے میدان میں وارد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے پرچم تلے ہم عالمی معاشرہ کو کسی بھی روش اور سلیقہ کو بروئے کار لاکر اپنا مخاطب قرار دے سکیں۔ بلا شک و شبہ اخلاق، اقوام و ملل کے درمیان ایک رہنما کے طور پر صحیح وسالم زیست تک پہونچنے کے لئے تمدّن سازی کے میدان میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔اس تحلیل نے تمدّن ساز، فقہ اخلاقی کی طرفداری کے ساتھ مظنونات عقلائیہ کو بروئے کار لاکر اسلامی کے سیاسی طرز تفکر کے سامنے ایک نیا راستہ کھولا ہے جو فقہ میں ایک بنیادی طریقہ کار کے عنوان سے

اجتماعی سطح پر بڑی تبدیلیوں کے لئے زمین فراہم کر سکتا ہے۔ تمدّن ساز اسلام کے بارے میں امام خمینیؒ کے افکار و نظریات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اور ایک خاص زاویہ نظریہ سے یہ تحقیق اس بات کے درپے ہے کہ تظنّن عقلائی، مطلقِ ظنون کی کارکردگی کے ضمن میں عقل وخرد جمعی کی پیروی کے لئے ارباب اجتماع [فقہی حاکمیت] کے سامنے ایک راستہ کھولے۔ اس موضوع تک رسائی فقط اس وقت ممکن ہوگی جب اخلاق انسانی کے تغییر ناپذیر اصول یعنی آزادی اور مدارات اس وصف کی پشت پناہی کریں ورنہ ایجادِ تشکیک کے ضمن میں ہر ضرورت کا بیان، تمدّن ساز حاکمیت، اصحاب عقول اور مخاطب معاشرہ کے لئے دوطرفہ خسارہ کی بنیاد ڈالے گا۔

اصلی منابع ومآخذ

۱۔ محقق کرکی، علی بن عبد العالی (۱۴۰۷ھ) جامع المقاصد، قم، مؤسّسہ آل البیت

۲۔ انصاری محمد علی، (۱۴۱۵ھ) الموسوعۃ الفقہیۃ المیسر، قم، مجمع الفکر الاسلامی

۳۔ محقق کرکی، علی بن عبد العالی (۱۴۰۷ھ) جامع المقاصد، قم، مؤسسہ آل البیت

۴۔ صالح مازندرانی، مولی محمد (۱۴۲۱ھ) شرح اصول کافی، تحقیق و تعلیق ابوالحسن شعرانی، بیروت، دار احیاء التراث العربی

۵۔ الخوئی سید ابوالقاسم (۱۴۱۰ھ)، الاجتہاد والتقلید، قم، دار الھدی، چاپ سوّم

۶۔ محمد علی انصاری، (۱۴۱۵ھ)، الموسوعۃ الفقہیۃ المیسر، قم، مجمع الفکر الاسلامی

۷۔ الخوئی سید ابوالقاسم (۱۴۱۰ھ)، الاجتہاد والتقلید، قم، دار الہدی، چاپ سوّم

۸۔ خازم علی (۱۴۱۳ھ)، مدخل الی علم الفقہ عند المسلمین الشیعہ، بیروت، دار الغربہ

۹۔ داود فیرحی (۱۳۹۰ھ) فقہ وسیاست درایران معاصر، تہران، نشرنی

۱۰۔ سلّار دیلمی، حمزہ بن عبد العزیز (۱۴۱۴ھ)، المراسم العلویہ فی احکام النبویہ، تحقیق سید محسن الحسینی الامینی، قم، المجمع العالمی لاھل البیت

۱۱۔ مکی عاملی، محمد بن جمال (بی تا)، القواعد والفوائد، تحقیق عبد الہادی حکیم، قم، مکتبۃ المفید

۱۲۔ خازم علی، (۱۴۱۳ھ)، مدخل الی علم الفقہ عند المسلمین الشیعہ، بیروت، دار الغربہ

۱۳۔ خازم، علی، (۱۴۱۳ھ)، مدخل الی علم الفقہ عند المسلمین الشیعہ، بیروت، دار الغربہ

۱۴۔ محمد غزالی، (بی تا)، احیاء علوم الدین، (بی جا)، دار الکتب العربی

۱۵۔ مکی عاملی، محمد بن جمال، (بی تا)، القواعد والفوائد، تحقیق عبد الہادی حکیم، قم، مکتبۃ المفید

۱۶۔مشکاتی عباس علی،(۱۳۸۹)،مقدمہ ای بر مناسبات فقہ و حکومت ،مجلّہ کاوشی نو در فقہ اسلامی ،سال ۱۷،ش ۶۵، صص۲۳۔۶۳

۱۷۔اسلامی رضا،(۱۳۸۷)،اصول فقہ حکومتی، قم، مرکز تحقیق فرہنگ واندیشہ اسلامی

۱۸۔ایزدھی سجاد ،(۱۳۸۹۰)،برداشتی ازدیدگاہ آیت اللہ خامنہ ای، پیرامون فقہ سیاسی ،حکومت اسلامی ،سال ۱۵،ش ۵۶، صص۶۹۔۱۱۰

۱۹۔ مہریزی، مہدی، (۱۳۷۶)، فقہ حکومتی، مجلّہ نقد و نظر، ش ۱۲

۲۰۔ایزدھی، سجاد(۱۳۸۹)،برداشتی ازدیدگاہ آیت اللہ خامنہ ای پیرامون فقہ سیاسی ،حکومت اسلامی ،سال ۱۵،ش۵۶، صص۶۹۔۱۱۰

۲۱۔ سبحانی، جعفر، (۱۴۰۵ھ)، تطور فقہ نزد شیعہ، مجلّہ تراثنا،سال اوّل، ش ۲، صص ۱۵۔ ۳۴

۲۲۔فوزی، یحییٰ، صنم زادہ ، محمود رضا،(۱۳۹۱)، تمدّن اسلامی از دیدگاہ امام خمینی ،فصلنامۂ تاریخ فرہنگ و تمدّن اسلامی، سال سوّم، ش ۹، صص ۴۵۔ ۷۴

۲۳۔ معین، محمد ،(۱۳۶۷)، فرہنگ فارسی، تہران ،امیرکبیر

۲۴۔کاشفی، محمد رضا، (۱۳۸۴)، تاریخ فرہنگ و تمدّن اسلامی، تہران،انتشارات مرکز جہانی علوم اسلامی

۲۵۔ویل ڈورانٹ (۱۳۷۰)، تاریخ تمدّن، ترجمہ حمید عنایت ودیگران، تہران ،آموزش انقلاب اسلامی، چاپ پنجم

۲۶۔ولایتی، علی اکبر ،(۱۳۸۴)، پویایی فرہنگ و تمدّن اسلام وایران، تہران،انتشارات وزارت امور خارجہ

۲۷۔یوکیبجی، فوکوتساوا، (۱۳۷۹)، نظریۂ تمدّن، ترجمہ چنگیز پہلوان، تہران، نشر گیو، چاپ دوّم

۲۸۔احمد،امین، (۱۴۲۵ق)، ضحیٰ الاسلام، بیروت، دار الکتب العلمیہ

۲۹۔ہانٹینگٹون، سموئیل، (۱۳۷۰)، سامان سیاسی در جوامع دستخوش تغییر، ترجمہ محمد تلاشی، تہران، نشر علم

۳۰۔لوکاس، آرنولڈ (۱۳۸۲)، تاریخ تمدّن، ترجمہ عبد الشمس آذرنگ، تہران، نشر سخن

۳۱۔ٹوین بی، آرنولڈ (۱۳۷۶)، بررسی تاریخ تمدّن، ترجمہ محمد رضا آریا، تہران، نشر امیر کبیر

۳۲۔روح الامینی، محمود، (۱۳۷۹)، زمینۂ فرہنگ شناسی، تہران،انتشارات عطار، چاپ پنجم

۳۳۔ساروخانی، باقر، (۱۳۸۰)، درآمدی بر دائرۃ المعارف علوم اجتماعی، ج ۱

۳۴۔آشوری، داریوش، (۱۳۸۱)، تعریف ها و مفاہیم فرہنگ، تہران، انتشارات آگہ

۳۵۔ سمرانی، اسعد (۱۳۶۹)، اندیشہ مصلح، ترجمہ صادق آئینہ وند، تہران، انتشارات دفتر نشر فرہنگ اسلامی

۳۶۔شریعتی، علی (بی تا) ،تاریخ تمدّن، تہران، چاپ پخش، ج۲

۳۷۔داوری اردکانی، رضا، (۱۳۷۹)، اتوپی و عصر تجدد، تہران، نشر ساقی

۳۸۔ابن خلدون، عبد الرحمٰن، (۱۳۸۸)، مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ محمد پروین گنا بادی، تہران، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، ج۴

۳۹۔ جعفری، محمد تقی، (۱۳۷۳)، فرہنگ پیرو فرہنگ پیشرو، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی

۴۰۔ولایتی، علی اکبر، (۱۳۸۴)، پویایی فرہنگ و تمدّن اسلام و ایران، تہران، انتشارات وزارت امور خارجہ

۴۱۔فوزی، یحییٰ؛ صنم زادہ، محمود رضا (۱۳۹۱)، تمدّن اسلامی از دیدگاہ امام خمینی، فصلنامہ تاریخ فرہنگ و تمدّن اسلامی، سال سوّم، ش۹ صص ۴۵۔۷۴

۴۲۔ معینی، فائزہ (۱۳۸۷)، دانشگاہ تمدّن ساز اسلامی ایرانی، تہران، دفتر برنامہ ریزی اجتماعی و مطالعات فرہنگی وزارت علوم

۴۳۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۴۴۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۴۵۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۴۶۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۴) ،دیدگاہ ہائے فرہنگی امام خمینی، تہران، ذکر

۴۷۔ صاحب الزمانی، ناصر الدین (بی تا)، سہم اسلام در تمدّن جہانی، تہران، بعثت

۴۸۔ صدری، احمد (۱۳۸۰)، مفہوم تمدّن و لزوم احیای آن در علوم اجتماعی، تہران، انتشارات مرکز بین المللی گفتگوی تمدّن ها

۴۹۔ جان احمدی، فاطمہ (۱۳۸۸)، تاریخ فرہنگ و تمدّن اسلامی، تہران، دفتر نشر معارف

۵۰۔ سروش، عبد الکریم (۱۳۷۸)، بسط تجربہ نبوی، تہران، مؤسسہ فرہنگی صراط

۵۱۔ سروش، عبد الکریم (۱۳۷۸)، بسط تجربہ نبوی، تہران، مؤسسہ فرہنگی صراط

۵۲۔ مجتہد شبستری، محمد (۱۳۷۶)، ایمان و آزادی، تہران، انتشارات طرح نو

۵۳۔ خسرو پناہ، عبد الحسین (۱۳۸۲)، دائرۂ شریعت، تہران، دفتر نشر معارف

۵۴۔ مشکانی ،عباس علی (۱۳۸۹)، مقدمہ ی بر مناسبات فقہ و حکومت، مجلّہ کاوشی نو در فقہ اسلامی ،سال ۱۷،ش۶۵، صص ۲۳۔۶۳

۵۵فراستخواہ، مقصود ، (۱۳۷۳)، سرآغاز نواندیشی معاصر، تہران، شرکت سہامی انتشار

۵۶۔ مجتہد شبستری، محمد (۱۳۷۶) ایمان وآزادی، تہران، انتشارات طرح نو

۵۷۔ سبزواری، عباس علی (۱۳۹۱)، مدخلی بر مناسبات فقہ وتمدّن، مجلّہ کاوشی نو در فقہ، سال ۱۹،ش ۷۲، صص ۶۲۔۱۰۳

۵۸۔ فنائی، ابوالقاسم (۱۳۸۶)، دین در ترازوئے اخلاق، تہران، انتشارات صراط

۵۹۔ وحید بہبہانی، محمد باقر (۱۴۱۷ھ)، حاشیہ مجمع الفائدہ والبرھان، قم، مؤسسہ علامہ المجدد

۶۰۔ فنائی، ابوالقاسم (۱۳۸۶)، دین در ترازوئے اخلاق، تہران، انتشارات صراط

۶۱۔ حسین زادہ، محمد؛ محمدی، عبداللہ (۱۳۸۹)، اعتبار معرفت شناختی خبر واحد در اعتقادات دینی، فصلنامہ ذہن، شمارہ ۴۳ صص ۱۴۱۔۱۶۸

۶۲۔ مکارم شیرازی، ناصر (۱۴۲۱ھ)، الامثال فی تفسیر کتاب اللہ المنزل، قم، مدرسہ امام علی بن ابی طالب، چاپ اوّل

۶۳۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۱

۶۴۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۵

۶۵۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۵

۶۶۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۵

۶۷۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۷)، خود باوری و خود باختگی از دیدگاہ امام خمینی، تبیان موضوعی، دفتر ۲۶، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۶۸۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۴

۶۹۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۴)، دیدگاہ فرہنگی امام خمینی، تہران، ذکر

۷۰۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۴)، دیدگاہ فرہنگی امام خمینی، تہران، ذکر

۷۱۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۸۱)، ولایت فقیہ، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۷۲۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۹)، رویاروئی با تہدیدات معاصر در اندیشہ امام، تہران، ستاد بزرگداشت یکصدمین سالگرد امام خمینی

۷۳۔امام خمینی، سید روح اللہ (بی تا)، کشف الاسرار، قم، آزادی

۷۴۔فیرحی، داود (۱۳۹۰)، فقہ وسیاست در ایران معاصر، تہران، نشرنی

۷۵۔کلینی، محمد بن یعقوب (۱۳۹۲)، الکافی، ترجمہ حسین استاد ولی، تہران، انتشارات دار الثقلین، چاپ سوّم

۷۶۔ری، شہری، محمد (۱۳۷۵)، میزان الحکمہ، قم، دار الحدیث

۷۷۔حرانی، حسن بن شعبہ (۱۳۵۵)، تحف العقول، مترجم احمد جنتی، تہران، انتشارات علمیہ اسلامیہ

۷۸۔ حسینی شیرازی، سید محمد (۱۴۲۳ھ) فقہ العولمہ، بیروت، مؤسسۃ الفکر الاسلامی

۷۹۔گلپائگانی، سید محمد رضا (۱۴۱۲ھ)، الدرر المنضود فی احکام الحدود، تقریر علی کریمی چہرمی، قم: دار القرآن الکریم

۸۰۔طوسی، محمد بن حسن (۱۳۸۷ھ)، المبسوط فی فقہ الامامیہ، تصحیح محمد بن تقی کشفی، تہران، المکتبۃ الرضویہ

۸۱۔منتظری، حسین علی (۱۴۱۷ھ)، نظام الحکم الاسلامی، تصحیح جمعی از پژوھشگران، قم نشر سرائی

۸۲۔سید محمد باقر الصدر، (۱۴۱۷ھ)، اقتصادنا، تحقیق عبد الکریم ضیا ودیگران، قم، دفتر تبلیغات اسلامی

۸۳۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۳

۸۴۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۴

۸۵۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۵

۸۶۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۲

۸۷۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۸

۸۸۔امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۷۸)، صحیفہ امام، تہران، مؤسّسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۵

۸۹۔خواجہ نصیر الدین طوسی (۱۳۹۱)، اخلاق ناصری، مترجم مجتبی مینوی، علی رضا حیدری، تہران، خوارزمی

۹۰۔محمد بن یعقوب کلینی (۱۳۹۲)، الکافی، مترجم حسین استاد ولی، تہران، انتشارات دار الثقلین، چاپ پنجم

۹۱۔ حرانی، آمدی حسن بن شعبہ (۱۳۵۵)، تحف العقول، مترجم احمد جنتی، تہران، انتشارات علمیہ اسلامیہ

۹۲۔آمدی، عبد الواحد بن محمد (بی تا)، غرر الحکم ودر الکلم، مصحح مہدی رجائی، قم، دار الکتاب الاسلامی

۹۳۔صدوق، ابن بابویہ قمی (۱۴۱۳ھ) من لایحضرہ الفقیہ، قم، انتشارات اسلامی، ج۴

۹۴۔ نہج البلاغہ (۱۳۹۴)، ترجمہ علی شیروانی، قم، نہاد نمائندگی مقام معظم رہبری در دانشگاھھا، حکمت ۷۰

۹۵۔ اسراء، ۳۷

۹۶۔ صدوق، ابن بابویہ قمی (۱۳۷۷)، خصال، مترجم، محمد باقر کمرہ ای، تہران، انتشارات کتابچی

۹۷۔ قابل، احمد (۱۳۹۱)، مبانی شریعت، نشر مجازی

۹۸۔ مرتضی مطہری (۱۳۷۶) ، اسلام ومقتضیات زمان، تہران، انتشارات صدرا

۹۹۔ امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۸۲)، شرح حدیث جنود عقل و جہل، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۱۰۰۔ امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۸۰) صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی

۱۰۱۔ بشیریہ، حسین (۱۳۷۴)، دولت عقل، دہ گفتار در فلسفہ و جامعہ شناسی سیاسی، تہران، مؤسسہ نشر علوم نوین، چاپ اول

۱۰۲۔ آرنٹ، ہانا (۱۳۵۹)، خشونت، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، تہران، خوارزمی، چاپ اول

۱۰۳۔ امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۸۰)، صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۶

۱۰۴۔ امام خمینی، سید روح اللہ (۱۳۸۰)، صحیفہ امام، تہران، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ج۷

۱۰۵۔ فتحی، یوسف (۱۳۸۸)، رابطہ اخلاق و سیاست باتاکید بر اندیشہ امام خمینی، فصلنامہ حکومت اسلامی، سال چہارم شمارہ ۳

تمدن ساز یونیورسٹی نصاب کی شناخت

گروہ مؤلفین: حسن نجفی،[۱] ڈاکٹر مہدی سبحانی نژاد[۲]

مترجم: سید محمد جون عابدی

خلاصہ

علم و دانش و ثقافت کا مرکز ہونے کے عنوان سے یونیورسٹیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ ثقافتی اور سماجی تحول و تبدیلی کی راہ میں علم و معرفت اور کردار سازی کے اصول کو منتقل کریں، اسے فروغ دیں اور جدید علوم اختراع کریں، اس طرح کسی بھی تہذیب کی تشکیل اور ترقی میں ان یونیورسٹیز کا شمار اہم اور مؤثر عنصر کے طور پر ہوگا۔ اس بات کا دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹیز تہذیبوں کی برقراری کے لئے ستون کی حیثیت رکھتی ہیں اور بغیر یونیورسٹی کے کوئی بھی تہذیب ترقی نہیں کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی یونیورسٹی کا نصاب تعلیم بنیادی عنصر ہوتا ہے جو تہذیب و تمدن کی تعمیر جیسے عظیم مقاصد کے احقاق و تشکیل کی راہ میں ناقابل انکار اور حتمی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اس تحریر میں وضاحتی اور نتیجہ خیز طریقہ کار کو اپناتے ہوئے یونیورسٹی کے تہذیب ساز نصاب تعلیم کی شناخت اور اسکے تشکیل کی خصوصیت کو ترسیم کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس سلسلہ میں جو نتائج حاصل ہونگے وہ اس بات کی حکایت کریں گے کہ کوئی بھی یونیورسٹی اسی صورت میں تہذیب و تمدن کی تشکیل میں صف اول میں قرار پاسکتی ہے جب اس کے پاس ایسا بہترین نظام اور تعلیمی نصاب ہو جس کی بنیادیں عقائد، افکار اور اسلامی اعتقادات اور مقامی میراث پر استوار ہوں۔ اس بناء پر نصاب تعلیم کے چار عناصر سامنے آتے ہیں: دین، عقلانیت (تعقل گرائی)، علم اور اخلاق؛ لہٰذا تشکیل نصاب، اس کے نفاذ اور اس کی تشخیص کے لئے ان اصولوں کے معتدل استعمال کے ذریعہ یونیورسٹیاں جدید تہذیب کی تشکیل اور آئیڈیل اسلامی معاشرہ کی بنا کا مرکز قرار پاسکتی ہیں۔ نتیجۃً اس قسم کے تصورات اور مفاہیم میں غور

۱۔ پی ایچ ڈی اسٹوڈنٹ، شعبہ تعلیمی نصاب، دانشگاہ علامہ طباطبائیؒ۔

۲۔ لکچرار، شعبہ تربیتی علوم، دانشگاہ شاہد۔

و فکر کرنا اور اس کے اصل پیغام اور خدوخال کو آمادہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ علم اور غور و فکر کی فضا کو ایجاد کیا جاسکے اگرچہ اس راہ میں مختلف نظریوں اور فکری آزادای کی فضا کا قائم ہونا ایک لازمی امر ہے۔

مقدمہ

ایران کا اسلامی معاشرہ جو دو عناصر سے آمیختہ ہے ایک "ایرانی" دوسرا ہے "اسلامی"، یہ معاشرہ نہ صرف مادی تہذیب و تمدن پر سخت تنقید کرتا ہے بلکہ اسلامی رنگ کے ساتھ جدید تہذیب کا دعویدار بھی ہے۔ یہ تہذیب اپنے جدید شعار اور نعروں کے ساتھ رفتہ رفتہ، مسلسل اور مستحکم طور پر زندہ ہو رہی ہے اور اس تہذیب کی جڑیں عمیق ہیں جو عظیم ثقافت کا حصہ ہیں۔ جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کے لئے سیکولر اور مادی تہذیب کے اصولوں کو استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان دونوں کے اصول، بنیادیں، اور نتائج ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں اور ان کو آپس میں ملانا غیر معقول بات ہوگی۔ ماڈرنیٹی، سیکولر تہذیب کی پیداوار ہے جو خدائی مدینہ فاضلہ کی تہذیب سے کوسوں دور ہے۔ تو موجودہ تہذیب ،جو سیکولر علوم، ڈھانچہ اور نتائج کو شامل ہو اور جس کا سرچشمہ مادی تہذیب اور علم ہو، اسے اختیار کرنے کے نتائج بہت خطرناک ہونگے۔ چنانچہ مطلوبہ مقاصد اور اسلامی جمہوریہ کی تقویت اور اس کے استحکام کے لئے جدید اسلامی تہذیب کے اصول کی تعمیر کے سلسلہ میں گفتگو اور اس میں غور و فکر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ غیروں کی تہذیب سے متاثر ہونے بلکہ اس میں تحلیل ہو جانے کا خطرہ بنا رہے گا اور خود اسلامی نظام کو بھی اس سے دور نہیں کیا جاسکے گا؛ تو اگر آج جدید اور نوخیز اسلامی نظام کے دانشور افراد اسلام کی گذشتہ روشن تاریخ سے نصیحت نہیں لیتے ہیں تو اپنی قوم کے لئے روشن مستقبل کی توقع نہیں کر سکتے ہیں۔(۱) اور اس مسئلہ پر رہبر انقلاب حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای دامت برکاتہ، مسلسل تاکید فرماتے آئے ہیں: "ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اگر احتیاط نہیں کریں گے تو معاشرہ دھیرے دھیرے اقدار سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور اس مقام پر پہونچ جائیگا کہ صرف اس کا اوپری خول باقی بچے گا۔ اور اس وقت ایک بہت بڑا امتحان ہوگا، یعنی قیام امام حسین کا امتحان، اور یہ معاشرہ اس امتحان میں ناکام ہو جائیگا!" (۲)

اسلامی افکار و عقائد کے مطابق اصل طاقت و قدرت کا حصول، عظیم اور بلند انسانی مقاصد کو قائم کرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ شہید صدرؒ کی تعبیر کے مطابق انفرادی اور سماجی میدان میں انسان کی ترقی اور اس کی تہذیب کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی صلاحیتیں، خصوصیتیں اور استعداد بروئے کار آجائیں کیوں کہ یہ چیزیں

انسان کی حقیقت و ماہیت کو معین کرتی ہیں۔(ثابت و ہمکاران، ۱۳۹۳: ۲۰۵) اوراس طرح اللہ کی جانب سے انسان مقام خلافت کاحقدار ہو جاتا ہے اور اسماء و صفات الٰہی کا مظہر قرار پاتا ہے، اسکی تمام ظاہری اور پوشیدہ صلاحتیں بروئے کار آجاتی ہیں اوراس کے لئے علم، قدرت اور عدل وانصاف جیسی بلند اقدار، ترقی اور کمال کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔(صدر، ۱۴۲۴ھ: ۱۲۷)

اس قسم کی تہذیب کے لئے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہے جو تاریخ سے آگاہی اور بصیرت کے ساتھ تہذیب کے پیغام اور اس کی ذمہ داری کو معاشرہ کی روح میں منتقل کر سکیں اور جدید تہذیب کی بنیادی ضرورتوں اور اجزا کو مہیا کرا سکیں۔ اور اس ذمہ داری کو ایک تہذیب ساز دانشگاہ بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ تو اس عظیم پروجیکٹ کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس تہذیب کی خصوصیات سے آشنائی پیدا کریں جس کی ہم بنا رکھنا چاہتے ہیں اور اس تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ تو ابتدائی ضرورتوں کے معین ہو جانے کے بعد ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ کون سی حکمت عملی اپنائی جائے اور کن راہوں اور وسائل کو انتخاب کیا جائے۔(۳)

نصاب تعلیم انہیں وسائل میں سے ایک ہے، تعلیمی نصاب کے بنیادی ڈھانچہ، اس کے استعمال اوراس کی تاثیر کی گہرائی کو پرکھنے بعد اسے یونیورسٹیوں کے مدیروں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اسے استعمال کر سکیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی معاشرے کی یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب، اس کی ثقافت، سابقہ تہذیب، مکتب فکر اور علمی سنت و روایات سے خالی ہو اور معاشرے کو کامیابی سے بھی ہمکنار کردے۔ تعلیمی نصاب کا نظام ایسا ہونا چاہئے کہ اسمیں معاشرے کے بنیادی تصورات اور اس کے فکری ڈھانچہ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور اس کے ساتھ مسلسل سازگاری اور تعلق برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہا جائے۔ یایوں کہاجائے کہ ہر معاشرے کی یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کے نظام اوراس معاشرے کی ثقافت اور تہذیب کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے۔(۴) دوسری بات یہ ہے کہ اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دینے میں ہم جتنی زیادہ تاخیر کریں گے ہمیں اسکا نقصان بھی اتنا ہی زیادہ اٹھاناپڑیگا۔ان تمام باتوں کے علاوہ جس نکتہ پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس کہ اب تک ہم اس سے غافل بھی رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم نے اس بات سے چشم پوشی کی ہے کہ یونیورسٹی کے تہذیب ساز ہونے کی راہ میں تعلیمی نصاب کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ تحقیقی میدان کو جسے ماہرین، تعلیم وتربیت کا قلب کہتے ہیں، اسی کے حال پر چھوڑ دیا گیا اور نہ ہی اسے بہتر بنانے کی فکر رہی نہ کسی نے اس راہ میں کوشش کی۔ چنانچہ ان مطالب کے پیش نظر اس تحقیق اور تحریر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کی ماہیت کیسی ہونی

چاہئے۔ اور اس اہم مطلب کو سمجھنے کے لئے نصاب تعلیم، یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب اور اس کی سطح اور اسلامی تہذیب کی تشکیل جیسے تصورات اور مفاہیم کی تشریح ضروری ہوگی۔

اس تحقیق کا طریقہ اور روش

اس تحقیق کے لئے تجزیاتی اور نتیجہ خیز روش اور طریقہ کا انتخاب کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مقصد تہذیب ساز یونیورسٹیوں کے تعلیمی نصاب کی کیفیت، ماہیت اور اس کے اصل اہداف سے آشنائی پیدا کرنا ہے۔ تو اس طریقہ تحقیق کے پیش نظر اس موضوع سے متعلق تمام Statistical population شماریاتی آبادی کے اسناد، ماخذوں اور اطلاعات کی چھان بین اور تحقیق کی گئی ہے۔ اس موضوع سے متعلق اسناد کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لئے ان میں سے مجموعی تحقیقوں، ان کی رپورٹس، انٹرنٹ، اخباروں یا جریدوں میں نشر شدہ مضامین و مقالات وغیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطالب کو کتابخانہ (لائبریری) کی روش کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ اور اس تحقیق کا وسیلہ، نوٹس اور مطالب کے تجزیات سے ملنے والی اطلاعات کے فارم کو قرار دیا گیا ہے تاکہ اس تحقیق کی کیفیت بہتر ہوسکے۔

انکشافات اور نتائج

ا۔ تعلیمی نصاب

تعلیمی نصاب کا تصور اپنی چھوٹی سی تاریخ میں متعدد تبدیلیوں اور تغیرات کے مراحل سے گزرا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک تعلیمی نصاب کا تصور صرف روایاتی حد تک محدود تھا اور صرف تعلیمی موضوعات اور تعلیمی نصاب کو شامل ہوتا تھا۔ ان سالوں میں تعلیمی نصاب صرف "نصاب کے مضامین، کیا پڑھایا جائے، طلاب سے متعلق امور، مدرسہ کے تجربوں، ایک سال یا ایک تعلیمی دورہ کے لئے مختلف تعلیمی موضوعات، تعلیمی اہداف و مقاصد کی فہرست یا دروس کی فصل بندی اور ترتیب" جیسے امور کو ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا سے تعلیم وتربیت کی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہونے لگا جس کی وجہ سے روایتی تعلیمی نصاب کا تصور اور مفہوم بہت زیادہ تبدیلیوں سے دچار ہوا۔ اور اسکا جدید تصور "تعلیمی کارکردگیوں اور اس کے تجربات کو تعلیمی مراکز کی نظارت کے تحت مرتب اور منظّم کرنا ہوگیا، تاکہ متعلّمین اور طلاب کی انفرادی اور سماجی ترقی ہوسکے اور وہ اپنے تعلیم کے اہداف تک پہونچ سکیں"۔ تعلیمی نصاب پر اس عنوان کے تحت توجہ دی جانے لگی۔ یہ نیا تصور یا اس سے مشابہ دیگر تصورات، نظریات اور تھئیوریز کی بنیاد اور معیار قرار پائے اور انہیں کے تحت

تعلیمی نصاب کا خاکہ تیار کیا گیا جانے لگا۔ اور تعلیمی نصاب خود ایک علمی موضوع بن گیا جس میں اس مسئلہ سے متعلق مطالعہ ، تحقیق اور تھیوریز بیان ہونے لگیں۔ اس موضوع کے وجود میں آتے ہی متعدد یونیورسٹیز اور علمی مراکز نے مختلف سطحوں میں اس موضوع میں تحقیق اور مطالعہ کے لئے نئے شعبہ کی بنیاد رکھ دی۔ (۵)

تعلیمی نصاب کے اندر پوشیدہ مختلف تصورات کے پیش نظر یہ فطری امر ہے کہ اس کی مختلف تعریفیں بھی ہوں۔

تو اس بات کے تحت :

شریعتمداری (۶) کی تعریف کے مطابق تعلیمی نصاب ''وہ تمام تجربات ، تحقیقات ، بحث و گفتگو، مطالعات، انفرادی یا گروہی سرگرمیاں اور دیگر کام ہوتے ہیں جنہیں ایک طالب علم کسی تعلیمی مرکز کی سرپرستی اور رہنمائی میں انجام دیتا ہے''۔ اس تعریف کے مطابق تعلیمی نصاب، طلاب کے ذریعہ کلاس میں انجام پانے والی کارکردگیوں اور فعالیتوں (سرگرمیوں) تک محدود نہیں ہوتا ہے۔

ڈال[1] (۷) کی نظر میں تعلیمی نصاب یعنی وہ مواد اور رسمی اور غیر رسمی نظام جس کے ذریعہ علم حاصل کرنے والے افراد ، اساتید کی نظارت میں علم اور فہم و ادراک کے طریقوں یا مہارتوں کو سیکھتے ہیں یا اس کے تحت اپنے اقداری نظام اور زاویہ نظر میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ اس کی نگاہ میں علمی مرکز کی فضا اور ماحول میں ایک منظّم اور رسمی اور ایک غیر منظّم اور غیر رسمی تعلیمی نصاب پوشیدہ ہوتا ہے۔ منظّم اور رسمی تعلیمی نصاب مواد، اہداف ، درسی موضوعات کے مقاصد اور منظّم تعلیمی سسٹم کو شامل ہوتا ہے جبکہ غیر منظّم اور غیر رسمی تعلیمی نصاب میں نفسیاتی تعامل، راہ و روش اور گروہی تحرک بالخصوص احساسات (جذبات) ، نظریات اور اس تعلق کو شامل ہوتا ہے جو شاگردہ اور استاد کے درمیان ہوتا ہے۔

آیزنر[2] (۸) کی نگاہ میں تعلیمی نصاب : ایسے امور کے مجموعہ کو شامل ہو سکتا ہے جو از قبل ترتیب شدہ ہوتے ہیں جس کے نتائج ایک یا ایک سے زیادہ گروہ کے سامنے آتے ہیں۔ یہ تعریف، تعلیمی نصاب کی کچھ خصوصیات کی

۱۔ Doll

۲۔ Eisner

طرف اشارہ کرتی ہے : امور اور تدابیر کا مجموعہ ، تعلیمی نصاب اور پلاننگ[۱] کے درمیان ہماہنگی، تربیتی مقاصد اور نتائج جو افراد کو وسیع پیمانہ پر متاثر کرتے ہیں۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں کسی ایک تعریف پر اتفاق رائے نہیں ہے اور ہر صاحب نظر نے اپنے سلیقہ کے مطابق اس کی تعریف بیان کی ہے لیکن مجموعی طور تعلیمی نصاب کے لئے ایک تعریف اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ : رسمی تربیت کے لئے ایک ایسا پروگرام تیار کرنا کہ جس میں تربیت کے اہداف و مقاصد، اس کے فائدے، تربیت کے مواد، طریقہ کار ، اقدار کا بیان، تربیتی ماحول کی خصوصیات، مربی اور استاد کی ضرورت اور اس کی صلاحیت، مناسب زمان و مکان اور وسیلہ کو واضح اور روشن طور پر ذکر کیا جائے اور منظّم پروگرام کے تحت اس کو بیان کیا جائے "(۱۰)۔اور یہ ایک فطری تربیتی پروگرام کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ انسان فطری طور پر خاص صلاحتیوں اور استعداکا حامل ہے اور تربیتی پروگرام کے عنوان سے اس تعلیمی نصاب کو اس کی ان فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہئے۔

۲۔یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب اور اس کی سطح

اعلی تعلیم کا تعلیمی نصاب ایک قسم کا منسجم اور منظّم تربیتی پروگرام ہوتا ہے جو علمی اور سماجی دونوں لحاظ سے قوی ہوتا ہے اور غور و فکر کے ساتھ ، علم منتقل کرنے اور مہارتوں کا ایک وسیع تجربہ طلاب کے لئے فراہم کرتا ہے۔(۱۱)

دوسرے اعتبار سے یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب ، ایک منظّم راہ و روش، اقدار، فعالیت اور ثقافت کا مجموعہ ہوتا ہے جو سند اور سرٹیفکٹ کے علاوہ ، یونیورسٹی کو خاص کریڈٹ اور اعتبار عطا کرتا ہے ، نیز پروگراموں کے تعارف کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے اندرونی ڈھانچہ کو بہتر بنانے کے طریقوں اور اس کے طولانی اور کم مدت اہداف کو بیان کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے طور پر طلاب ، کالوجین (collegian)، (فارغ التحصیل) اور مینیجرز کے سامنے اس یونیورسٹی کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے ۔(۱۲)

۱۔ملکی(۹) اس سلسلہ میں معتقد ہیں کہ تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں "پلاننگ" کا لفظ سنتے ہی ذہن میں تربیت کے سلسلہ میں محدود نظریہ آنے لگتا ہے تو کیا تعلیم و تربیت میں مشغول افراد اس کے علاوہ کسی اور حقیقت کی جستجو میں ہیں؟ کیا ممکن ہے کہ تعلیم و تربیت ایک ضروری امر کے عنوان سے کسی کے ذہن میں ہو لیکن اسکے لئے کوئی تعلیمی نصاب نہ ہو؟!

ہر تعلیمی نصاب کے لئے ضروری ہے کہ حقائق، ضرورتوں اور تبدیلیوں کے مطابق ہو اور اس میں جامعیت بھی پائی جاتی ہو تاکہ طلاب کی صلاحیتوں اور مہارتوں میں ترقی کے ذریعہ توجہات کو اپنی طرف جلب کرسکے اور اس طرح موجودہ دنیاکے سامنے خود کو انفرادی اور سماجی اعتبار سے اعلی تعلیم کے بہترین اور مؤثر نتائج کے طور پر پیش کرسکے۔اس طرح کہ اس تعلیمی نصاب کے اندر اس پیچیدہ دنیا میں بھی اپنا کردار ادا کرنے کے لئے مطلوبہ مہارت، صلاحیت اور علم موجود ہو اور یہ نصاب تعلیم دنیا کے تبدیل ہوتے ہوئے خاکہ سے مقابلہ کی قوت رکھتا ہو۔ ورنہ بہت سے لوگوں خاص طور سے والدین، اساتید، حکومتوں اور طلاب کی نگاہ میں وہ تمام سرمایہ بے فائدہ اور بیکار ہو جائیگا جو انہوں نے اس کام کے لئے صرف کیا ہے۔(۱۳)

مجموعی طور پر یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب تیار کرنے والے افراد کی توجہ، اعلی تعلیم کی بنیادی ذمہ داریوں، شرائط اور تبدیلیوں پر ہونی چاہئے۔ اس امر کا لازمہ نصاب کے سلسلہ میں تحقیق اور غور و فکر ہوگا اور اس کے نتیجہ میں نصاب پر نظر ثانی ہوگی اور اس کو بہتر بنایا جاسکے گا۔ اس سلسلہ میں مختلف معاشروں کے اپنے تجربے رہے ہیں اور اعلی تعلیم سے متعلق افراد اس بات کے لئے کوشاں رہے ہیں کہ اعلی تعلیمی نظام کے اجزا میں نظر ثانی کی جائے اور انہیں پرکھا جائے۔ اور ان اجزا میں سے ایک جز تعلیمی نصاب ہے۔ مذکورہ باتوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی نصاب، اعلی تعلیم کے نتائج میں سے ہے جو اعلی تعلیم کی ذمہ داریوں اور اہداف و مقاصد کو تحقق بخشنے کی راہ میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم سے متعلق افراد کو اس بات پر خاص توجہ دینی چاہئے اور تعلیمی نصاب کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے مزید کوشش کرنی چاہئے۔

سرمد اور وزیری (۱۴) کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لئے چار تعلیمی نصاب بیان کئے جاتے ہیں:

الف) ترتیب شدہ تعلیمی نصاب[۱]: اس قسم کا تعلیمی نصاب دروس کی فصلوں اور ان کی فہرست کو شامل ہوتا ہے۔ یہ تعلیمی نصاب اس بات سے قطع نظر کہ عملی طور پر نافذ ہوگا یا نہیں، فیکلٹی ممبرز کی طرف سے تائید یافتہ ہوتا ہے۔ اور اس کا مواد اور اس کے دروس کا سلسلہ بھی ایسا ہوتا ہے جو یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کی حکمت عملی اور تعلیمی گروہ (استاد و شاگرد) کے مطابق ہوتا ہے۔

ب) تعلیمی نصاب جس کی توقع کی جاتی ہے[۲]: اس قسم کا تعلیمی نصاب خاص قسم کے اسائینمنٹس اور اس کارکردگی کی سطح کو شامل ہوتا ہے جسکی طالب علم سے توقع کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس میں طلاب کی علمی

۱۔ Desined Curriculum

۲۔ Exlectation Curriculum

صلاحیت اور کارکردگی کو پرکھنے کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے۔ اس قسم کا تعلیمی پروگرام عام طور سے خاص تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں طلاب کا عکس العمل ہوتا ہے۔

ج) بیان شدہ تعلیمی نصاب[۱]: یہ تعلیمی نصاب کلاس میں بیان شدہ مطالب اور عملی طور پر تدریس ہو جانے والے دروس کو شامل ہوتا ہے۔ اس قسم کا نصاب، توقع والے تعلیمی نصاب کے برخلاف، کردار سازی سے متعلق ہوتا ہے اور ممکن ہے کلاس میں دیا جانے والا درس ابتدائی خاکہ سے بہت زیادہ مختلف ہو۔ اس دوران ممکن ہے کسی بھی تعلیمی نصاب کے لئے نئی تمرینوں اور اسائینمنٹس کے مواد اور ان کے بیان کا طریقہ بھی ابتدائی خاکہ سے مختلف ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں تنوع بھی ہو بلکہ کچھ چیزیں غیر علمی بھی ہوں۔ اگرچہ نصاب تعلیم کے مؤثر ہونے کے سلسلہ میں بہت سے اعلی تعلیم کے مراکز اس قسم کے تنوعات سے بہت کم ہی آشنائی رکھتے ہیں۔

د) تجربہ شدہ تعلیمی نصاب[۲]: یہ وہ تعلیمی نصاب ہے جسے طلاب عملی طور پر انجام دیتے ہیں۔ تعلیمی نصاب کی ان اقسام اور سطوح میں کردار سازی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے اور انہیں دو الگ حصوں میں تقسیم بھی کیا جاسکتا ہے:

پہلے حصہ کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ طالب علم اپنے لئے دروس کا انتخاب کس طرح کرے کیونکہ ممکن ہے دروس کا انتخاب، تجویز شدہ رسمی طریقہ سے مختلف ہو۔ اور دوسرے حصہ کی توجہ سیکھنے اور تعلیم کے طریقہ پر ہوتی ہے جیسے ایک درس کے لئے کس مقدار میں لکھنے کی تمرین انجام پائے؟ کلاس میں گفتگو کے سلسلہ میں کتنی مہارت کا استعمال کیا جائے وغیرہ۔ اعلی تعلیم کے مراکز اس سلسلہ میں بھی بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔

۱۔ Deliverd Curriculum

۲۔ Experimented Curriculum

۳۔اسلامی تہذیب سازی

اس حصہ میں تین طرح کے تصورات: تہذیب، اسلامی تہذیب اور جدید اسلامی تہذیب کی طرف اشارہ کیا جائیگا۔

تہذیب کو شہریت، (۱۵) تحریری قوانین، مکتوبہ سنت، شہری انتظامیہ کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ تہذیب اس کے علاوہ سماجی، دینی و مذہبی، اخلاقی، جمالیاتی، ایک یا متعدد معاشروں کے مشترک علمی اور مہارتی امور اور ان کے باہمی تعلقات، (۱۶) آثار قدیمہ، خارجہ تعلقات، ملک کے اندرونی امور کی بہتر انجام دہی (۱۷) اور اقوام کے علوم و فنون و ترقی (۱۸) کو بھی شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح تہذیب ایسے سماجی نظم کو بھی کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ثقافتی تخلیقی صلاحیت سامنے آتی ہے۔ (۱۹) یا تہذیب کا اطلاق "کسی علاقہ، ملک، یا زمانہ کے افراد کی مادی اور روحانی کامیابیوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے جہاں ہر معاشرے کے ترقی یافتہ حالات اور اس کی منظّم فکری اور ثقافتی کامیابی کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس معاشرے کی علمی و فنی ترقی اور اس کی سماجی اور سیاسی مراکز کی افادیت کا پتہ چلتا ہے" (۲۰)

تہذیب کے معنی انسان کے سماجی ہونے سے ظاہر ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعہ اس تہذیب کی ثقافت سمجھ میں آتی ہے۔ (۲۱)

اسلامی تہذیب، ان اسلامی اقوام کی تہذیب کو کہا جاتا ہے جو عرب اقوام، ایرانیوں، ترکوں وغیرہ کی تہذیب کو شامل ہے۔ (۲۲) اور یہ تہذیبیں دین اسلام اور عربی زبان کے علمی اور ادبی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے متحد ہوئی تھیں۔ (۲۳) ایرانی، رومی اور دیگر معاشروں کے ہنر و فنون اس تہذیب میں مدغم ہوگئے ہیں۔ (۲۴)

اسلامی تہذیب نے گذشتہ تہذیبوں کی بہ نسبت ایک خاص موقف اپنایا تھا؛ اور وہ یہ تھا کہ نہ ہی یہ تہذیب ان کے مقابلہ میں آکر کھڑی ہوئی اور نہ ہی ان سے متاثر ہوئی۔ بلکہ ان کی اچھی چیزوں کو اختیار کرکے اپنے رنگ میں ڈھال لیا اور منفی چیزوں کو قبول نہیں کیا۔ یا یوں کہا جائے کہ "اسلامی تہذیب گذشتہ ثقافتوں کی نسبت نہ ہی مقلد محض رہی اور نہ ہی ان کا استمرار بنی بلکہ اس نے ان تہذیبوں کو ملا کر مکمل کر دیا۔ "(۲۵) اسلامی تہذیب، قرآنی تعلیمات کے سائے میں آفاقی اور عالمگیر نظریہ رکھتی ہے اور خود کو کسی ایک قوم یا نسل سے مخصوص نہیں جانتی، یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام کا وسیع میدان عرب، ایرانی، ترک، ہندی، چینی، مغولی، افریقی وغیرہ جیسی ساری اقوام کے لئے ہے یہاں تک کہ ذمی قومیں بھی اس سے آملیں۔ اس تہذیب کی بنیاد

اگرچہ بعض اسلامی نظریات پر رکھی گئی تھی لیکن اس میں بہت سی بنیادی کمیاں اور کمزوریاں رہی ہیں جیسے ائمہ معصومینؑ کی امامت کے بجائے ظالم کو حکومت دینا، حکومتوں اور عوام کا معصومینؑ کی ہدایت سے دور رہنا، ہر کسی کو اولی الامر مان لینا چاہے وہ زبردستی حکومت تک پہونچا ہو اور عوام پر ہر ظلم کو روا جانتا ہو، بادشاہوں کے اندر استبدادی پہلو ہونا، آزادی فکر کی مخالفت، عقیدہ جبر کی ترویج اور روشن فکر افراد کا مغرب زدہ اور اس کے سامنے تسلیم ہوجانا۔ اگرچہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی ہجری میں یہ تہذیب اپنی اوج پر تھی لیکن اس کے باوجود مغل جیسی وحشی قوم کے حملوں، قرون وسطی میں مسلمانوں کے خلاف مغربیوں کی جنگ اور اجنبی ثقافتوں کی تحمیل کے سامنے ٹک نہ سکی۔

جدید اسلامی تہذیب نہ ہی مسلمانوں کی تہذیب کا احیاء ہے اور نہ ہی اس کی تعمیر نو، بلکہ یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو اسلامی افکار، عقائد اور ثقافت پر مشتمل ہے اور اس کی شکل علمی اور منطقی ہے، اسمیں افراد اور اقوام کے درمیان تعلقات یا بین الاقوامی تعلقات خدادادی اور فطری نظم، قانون اور اخلاق پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔ اس تہذیب میں ضرورتوں کو پورا کرنے، قدرتی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کی ترقی کے لئے مسلسل کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس تہذیب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں ان امور کی شناخت کے سلسلہ میں نظام ہستی کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ تہذیب نیک اہداف ومقاصد اور ہمہ جہت ترقی اور تکامل کی راہ میں مسلسل جد وجہد کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس جدید اسلامی تہذیب کو بنانا اور اپنانا وقت کی ضرورت ہے۔

جدید اسلامی تہذیب، آج کی مغربی تہذیب کی طرح نہیں ہے جہاں انسان کو صرف ایک آلہ کار اور ٹول کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ سعادت، امن، ذہنی سکون اور زندگی کے مقصد جیسی اصل انسانی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکا ہے۔ (۲۶)

جبکہ جدید اسلامی تہذیب انسان کی تمام مادی اور روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور انسان کے چاروں قسم کے تعلقات یعنی خود، خدا، معاشرے اور اس ہستی کے ساتھ تعلقات کو شامل ہوتی ہے، اور انسان کے لئے دنیوی اور اخروی سعادت کا میدان فراہم کرتی ہے۔

مغربی تہذیب کی بنیاد ہیومنزم یعنی انسان پرستی کے عقیدہ پر استوار ہے۔ لیکن جدید اسلامی تہذیب کی بنیاد خدا پرستی پر ہے۔ مغربی تہذیب کی توجہ صرف مادی ضروریات کو پورا کرنے پر ہوتی ہے اور وہ روحانی ومعنوی

ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ جبکہ جدید اسلامی تہذیب کا مرکز و محور ہی روحانیت و معنویت ہے۔

جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کے لئے علم، ٹیکنالوجی، صحت عامہ، روحانیت، اقتصاد جیسے تمام امور میں ترقی اور معاشرے میں عقل اور اخلاقی اقدار سے سرشار حکومت کی ضرورت ہے۔ یہ ہمہ جہت ترقی معاشرے کی زندگی میں ظاہر ہونی چاہئے تاکہ انسانی طرز زندگی خانوادگی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور امن و سیکیورٹی جیسے تمام امور میں مکمل ہو جائے۔

نظریہ عالمیت (cosmopolitanism)، جاہلانہ تعصّبات کی نفی، تمام اقوام، نسلوں اور ممالک میں ہمزیستی اور باہمی زندگی، جدید اسلامی تہذیب کی تجلی اور انکشافات میں سے ہیں۔

جدید اسلامی تہذیب میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے انسانی عزت و کرامت کا احیاء ہوتا ہے۔ اور اسمیں ہمہ جہت ترقی، بلندی اور مادی و روحانی زندگی کے تمام پہلو تحقق پیدا کر لیتے ہیں۔ (۲۶)

جدید اسلامی تہذیب نہ صرف مغربی تہذیب کے مادی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف توجہ والے پہلو کی نفی نہیں کرتی ہے بلکہ اس کو جہت بھی دیتی ہے اور اسے زندگی کے آفات جیسے، فنائیت اور انکار کل (Nihilism) کے عقیدہ، محفوظ نہ ہونے کے احساس، ناانصافی اور زندگی کے بے مقصد ہونے کے احساس سے بھی نجات دلاتی ہے۔

۴۔ تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کی ماہیت اور خصوصیات

"**تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب**" کے تصور کے بارے میں گفتگو کا لازمہ ہے کہ اس کے سلسلہ میں ہونے والے ان سوالوں کے جواب پیدا کئے جائیں جن کے سائے میں اس تصور کے صحیح اور واضح معنی تک پہونچا جاسکتا ہو اور وہ سوالات اس طرح ہو سکتے ہیں:

تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کا فلسفہ کیا ہے؟ تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کے فلسفی اصول کیا ہیں؟ کیا تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کو کسی پروگرام کے تحت تشکیل دیا جاتا ہے یا یہ تعلیمی نصاب بغیر کسی پروگرام اور پلان کے تدریجی طور پر خود ہی بن جاتا ہے؟ یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب اور اسلامی تہذیب کے درمیان کیا نسبت اور تعلق ہو سکتا ہے؟

ایک مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب ساز یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب ایک ایسا تربیتی نقشہ یا پروگرام ہونا چاہئے جو چار ارکان یعنی دین، عقلانیت (تعقل گرائی)، علم اور اخلاق پر ٹکا ہو اور اس کی انتظامیہ

مؤمن، متقی اور دین کے پابند افراد ہوں۔ اور اس تعلیمی نصاب میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ آئیڈیل اسلامی معاشرہ تک پہونچانے والی طلاب کی صلاحیتوں اور استعداد کو بروئے کار لاسکے۔(۲۷)

دوسرے نظریہ کے مطابق یہ تعلیمی نصاب ،اسلامی معاشرے کی طرح وہ جگہ ہے جہاں اسلامی اقدار حاکم ہوتے ہیں۔ اور اگر اس تعلیمی نصاب میں اسلام کا عبادی، اعتقادی اور علمی اصول، اقدار کی صورت میں کارفرما رہے تو ایسے تعلیمی نصاب کو اسلامی تہذیب کے فلسفی اصولوں پر مشتمل تعلیمی نصاب کہاجاسکتا ہے۔(۲۸)

اس لحاظ سے تہذیب ساز تعلیمی نصاب ایسی آئیڈیالوجی، اقداری نظام، نظریات، اصول اور خصوصیات کو شامل ہوگا جو غیر تہذیب ساز یونیورسٹی کے نصاب تعلیم سے مختلف ہوگا۔

نقشہ شمارہ ا میں دیکھا جاسکتا ہے کہ چار تہذیب ساز ارکان کس طرح یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کے اجزا پر اپنا اثر رکھتے ہیں:

چار تہذیب ساز ارکان

دین، عقلانیت (تعقل گرائی)، علم، اخلاق، (اور ان کا اثر)

اہداف و مقاصد

مواد

طرز تعلیم

تعلیمی مواد، کتابیں تہذیب ساز یونیورسٹی کا تعلیمی نصاب

ترتیب

وقت

ماحول

قدر پیمائی/جانچ

پہلی شکل۔یونیورسٹی کے مختلف تعلیمی نصابوں پر تہذیب کے چار ارکان کی تاثیر

تہذیب ساز یونیورسٹیز کی تعلیمی نصاب پر توجہ ، اعلی تعلیمی نظام کے تین حصوں توانائی، روش اور نتیجہ کے سلسلہ میں پیش آنے والے خطرات سے مقابلہ کر سکتی ہے۔(۲۹)

امین خندقی اور حجازی(۳۰) کی تحقیق کے مطابق فلسفی، ثقافتی، سماجی، تعلیمی اور شناخت سے متعلق اسباب کو ان خطرات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ فلسفی خطرہ کے سلسلہ میں بہت سے صاحبان نظر ایران میں تعلیمی نصاب میں تحقیق کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ فلسفی اصول پر مبتنی موجودہ علم، تربیت کے قرآنی اور اسلامی فلسفہ کے مخالف ہے۔اور یہ علم پراگماٹیزم، اگزسٹیالزم، پوسٹ ماڈرنزم، اور فینومینالوجی (Phenomenology) جیسے مادی فلسفہ اور مکاتب فکر کے اصولوں پر مبتنی ہے۔(۳۱، ۳۲، ۹) اور اس کا مواد اسلامی تحریک کی ماہیت اور حقیقت کے منافی ہے۔جب ایران میں تعلیمی نصاب کے اصولوں اور اس کی غیر مذہبی ممالک کے تعلیمی نصاب کے ساتھ نسبت کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے تو وہاں مختلف ہونے سے مراد انسان، ہستی، معرفت اور اقدار کے سلسلہ میں مختلف تصورات ہوتے ہیں۔

ایک دوسرا خطرہ تہذیب ساز تعلیمی نصاب تیار کرنے میں ہے اور وہ اسلامی شناخت پر کم توجہ دینا ہے۔ سادہ لفظوں میں اسلامی شناخت کو قرآن کی آیت "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (۳۳) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اسلامی شناخت در اصل، دین سے اپنے تعلق، اس کی پابندی اور دینی معاشرے کے ساتھ تعلق کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسلامی شناخت کے سب سے اہم نتائج ، بنیادی سوالوں کے جواب، زندگی کو جہت دینا، عقیدہ میں اتحاد اور دنیا کو معنادار بنانا ہے۔(۳۴) اسلامی شناخت انسانوں میں برتری کے معیار کے سلسلہ میں کسی فرد یا گروہ کے بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری پر تاکید کرتا ہے۔ عصر حاضر میں بہت سے ایسے معاشرے ہیں جو علمی اور فنی پسماندگی کی وجہ سے اپنی شناخت کے سلسلہ میں تزلزل کا شکار ہوگئے ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ مغربی تہذیب سائنس اور ٹیکنالوجی کی دین ہے اسلئے مکمل طور پر مغربی علوم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔ تو چونکہ مغربی سیکولر علوم میں دین کا کوئی گزر نہیں ہے اس لئے ان معاشروں میں اسلامی افکار و عقاید پر کم توجہ دی جاتی ہے اور اسلامی شناخت میں خدشہ وارد کیا جانے لگتا ہے۔(۳۵)

ثقافتی خطرہ کے سلسلہ میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسلامی شناخت کی طرف واپسی اور اس شناخت کو دوبارہ حاصل کرنے کے دوران مسلمان مفکرین کی سمجھ میں آگیا کہ دنیائے اسلام مغربی فکر اور ثقافت کے ذریعہ برباد ہو چکا ہے؛ ایسی ثقافت، جو اسلامی تہذیب پر استوار ہو وہ ہر قسم کے غیر خدائی فلسفہ کی مخالف ہوگی، تو اس قسم کے

فلسفہ اور اس کے خطرات سے رہائی اور نجات کے لئے ایک جہادی تحریک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ علم و دانش اور نظریات بے طرف نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی فلسفی، دینی یا ثقافتی فکر کے حامل ہوتے ہیں جو فکر ان علوم و نظریات کو جنم دیتی ہے اور ان کو منتقل کرتی ہے۔ مغربی علوم اور وہ علم جو مغربی دنیا سے اسلامی تعلیمی نصاب میں داخل ہوا اس نے اسلامی نصاب تعلیم کو مغربی ثقافت، راہ و روش اور نیت سے آلودہ کر دیا ہے اور وہ نصاب تعلیم، مغربی رنگ میں ڈھل گیا ہے۔ (۳۶)

سماجی خطرہ کے سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ، ترقی، استقلال اور مستقل اسلامی ثقافت پر توجہ نہ دینا ہے۔ صاحبان نظر کا کہنا ہے کہ جب تک عمومی اور اعلی تعلیمی نظام میں تہذیب ساز نصاب تعلیم نہ ہوگا اس وقت تک مغربی ثقافت کے قبضہ سے باہر نکلنا اور مستقل اسلامی تہذیب تک پہونچنا ممکن نہ ہوگا۔ (۳۷) کیونکہ ہر تعلیمی نصاب کا ملک کی تہذیب کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ تو اسلامی نصاب تعلیم سے غفلت کا مطلب مستقل اسلامی تہذیب سے غفلت ہے۔ (۳۸) یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں فکری جدو جہد کا ایک مقصد، اسلامی معاشرہ پر مغربی ثقافت کو حاوی ہونے سے روکنا اور اس سے مقابلہ کرنا ہے کیونکہ مغربی ثقافت کی وجہ سے، اسلامی تعلیمی نصاب کے ماہرین، مغربی تعلیمی نصاب کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نصاب میں تبدیلی اس لئے بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ علم اسلامی معاشرے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ اور ان ضرورتوں اور تقاضوں میں سب سے زیادہ جو چیز توجہات کو اپنی طرح جلب کرتی ہے وہ اس علم کا اسلامی تعلیم اور اسلامی اقدار کے ساتھ تعلق اور رابطہ ہے۔ کیونکہ دینی علوم کا استمرار اور تعلیمی نصاب میں تجدید نظر، ہمہ جہت ترقی، توسیع اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ (۳۹) اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی ضرورتوں کا مختلف ہونا ہے کیونکہ اسلامی نگاہ سے زندگی کے مختلف شعبوں کی ضروریات مغربی ثقافت اور وہاں کی زندگی سے مختلف ہے۔ تو ملک میں ثقافتی خطرات اور اس میدان کا دین سے تعلق رکھنا اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ملک کے تعلیمی نصاب کو تہذیب ساز ہونا چاہئے۔ تعلیمی نصاب کے خطرات کو تعلیمی اسباب میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دور حاضر میں نظری اور عملی میدان میں مغربی ثقافت سے متاثر ہمارے کچھ صاحبان نظر کے نظریوں کی وجہ سے ملک کے تعلیمی نصاب کے ماہرین غیر معمولی طور پر مغرب زدہ ہو گئے ہیں اور فکری طور پر اس کے زیر تسلط آ گئے ہیں۔ اب چونکہ کسی نظریہ پر تسلط رکھنے والا شخص جو بات بھی کہتا ہے اس کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تو اسی بات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ لوگوں نے دین کے مسلمات کو بھی شک کے دائرے میں لا کھڑا کیا ہے اور مسلسل یہ کام کر رہے ہیں۔ (۴۰) ماڈرن علوم کے

تسلط اور ملک کے اکثر تعلیمی نصاب کے ماہرین پر اس کے حاوی ہونے کے ساتھ نصاب تعلیم تیار کرنے اور اس کی اہمیت اور اس کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر کسی کا اپنا نظریہ ہو گیا ہے۔ نصاب تعلیم کے سلسلہ میں اس خطرہ کے پیش نظر اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ (کیونکہ تہذیب ساز تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں اسلامی شناخت سے چشم پوشی کی جارہی ہے)۔ (۴۱)

نتیجہ

تشکیل تہذیب کے نکات میں سے ایک اہم نکتہ مستقبل کے لئے پروگرام تیار کرنا ہے۔اس سلسلہ میں روز مرہ کے مسائل سے بڑھ کر بڑی پلاننگ اور نظریات کی ضرورت ہے۔ اور اس راہ میں پہلا قدم اس قسم کی گفتگو کے لئے جرات و ہمت پیدا کرنا ہے اور جرات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مغربی تسلط سے مکمل طور پر باہر نکل آیا جائے۔ ہمارے بہت سے روشن فکر افراد میں مغربی تہذیب سے باہر نکلنے کی جرات ہی نہیں پائی جاتی ہے۔ انہیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں انہیں جاہل، غیر تہذیب اور ان سیویلائزڈ (uncivilized) نہ کہا جانے لگے۔ اب مغربی تہذیب میں وہ پہلی والی تازگی نہیں بچی ہے۔ دوسری طرف سے ویٹو پاور، ناانصافی، بین الاقوامی مراکز کا ناکارہ پن، استکباری تسلط وغیرہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب اپنے دعووں کے برخلاف کہ ایک انسانی تہذیب ہے، اس میں نہ ہی عدل وانصاف ہے اور نہ ہی آزادی پائی جاتی ہے۔ مغربی تہذیب کے سلسلہ میں نظریہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اور نظریہ کی اس تبدیلی نے دنیا کے دوسرے حصوں اور علاقوں کو ایک نئی حالت کے لئے تیار کر دیا ہے۔ (۴۲)

اس مقالہ میں یہ کوشش کی گئی کہ تہذیب ساز یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کی کیفیت اور اس کی ماہیت کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں عمیق اور گہری تحقیق کے لئے طویل وقت درکار ہے لیکن اس کے باوجود جتنی باتیں بیان ہوئی ہیں وہ صاحبان قلم میں یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں جرات پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر یہ آئیڈیا اور طریقہ اعلی تعلیمی نظام میں منظم اور مسلسل طور پر استعمال کیا جائے تو اس کے بہترین نتائج کو سماجی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور دینی میدان میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ نتائج تب ہی حاصل ہونگے جب تہذیب ساز تعلیمی نصاب:

۱۔ معاشرے پر حاکم تعلیم وتربیت کے فلسفی اصولوں کی بنیاد پر ہو۔

۲۔ اس میں خدائی پہلوؤں (جیسے تقدس، جامعیت، صداقت اور انسان کی پاک فطرت کو) نگاہ میں رکھا گیا ہو۔

۳۔ اور اس میں موجودہ حالات، وسائل اور صلاحیتوں کو لحاظ کیا گیا ہو۔

ان اہم امور تک دسترسی کے لئے ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے ماہرین افراد پوری سنجیدگی اور پابندی کے ساتھ اس میدان میں حاضر رہیں۔ کیونکہ جب تک یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب پر مغربی نظریات کی فضا حاکم رہے گی اس وقت تک ملک کی یونیورسٹیوں سے تہذیب ساز تعلیمی نصاب اور اس سلسلہ میں نئے نظریات کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ چاہے یونیورسٹی کے اساتید انفرادی طور مومن اور متقی ہی کیوں نہ ہوں۔

مذکورہ باتوں کے پیش نظر، تجربہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس قسم کے امور تک آسانی اور جلدی سے نہیں پہونچا جاسکتا ہے اور نہ ہی موجودہ اور ثابت حالت کو آسانی سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس میدان میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے طویل مدت اور دقیق پروگرامنگ کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں کم مدت میں اساتید کے ذہنوں پر حاکم مغربی فضا کو نہ ہٹایا جاسکے لیکن اس کے باوجود ایسے قدم اٹھائے جاسکتے ہی جو تعلیمی نصاب کے تہذیب ساز ہونے کی راہ میں مددگار ہوں۔ جیسے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں ان اساتید کے علاوہ ملکی سطح پر ایک مستقل علمی گروہ تشکیل دیا جائے جس کے اراکین وہ اساتید اور محققین ہوں جو تہذیب ساز نظریہ بھی رکھتے ہوں اور اس کے معتقد بھی ہوں۔ ان کی ذمہ داری صرف یہ ہو کہ تعلیمی نصاب کے موضوع پر تحقیق کریں اور خاص حکمت عملی کو استعمال کرتے ہوئے طلاب کو اس کے اصولوں سے روشناس کرائیں۔ اس کے علاوہ اساتید کو اس بات پر وادار کیا جائے کہ تہذیب ساز تعلیمی نصاب کے سلسلہ میں سطحی نظریہ کے بجائے علمی اور تحقیقی نظریات کو بیان کریں اور اس راہ میں معاشرے کے بنیادی اصولوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ اساتید کے ذہنوں سے مغربی نظریات کے تسلط کو ختم کرنے کے ساتھ ہی ایران میں (اور دوسرے اسلامی و غیر اسلامی ممالک) یونیورسٹی کے تہذیب ساز تعلیمی نصاب کی راہ میں قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

ماخذ:

•رضائی، عبدالعلی (۱۳۹۵) تحقق تمدن اسلامی و علم دینی؛ پیشران مطلوب در استحکام درونی نظام، تہران، خبر گزاری مہر.
•رہبر انقلاب اسلامی (۱۳۷۷) شمسی. خطبہ نماز جمعہ تہران. ۱۸/۰۲/۱۳۷۷ شمسی.
•خرمشاد، محمد باقر؛ آدمی، علی (۱۳۸۸) شمسی. انقلاب اسلامی، انقلاب تمدن ساز؛ دانشگاہ ایرانی، دانشگاہ تمدن ساز، فصلنامہ تحقیقات فرہنگی، ش۶، صص۱۶۱، ۱۸۸.
•آدمی، علی (۱۳۸۶) شمسی، دانشگاہ تمدن ساز؛ ضرورت تاریخ عصر جدید. تہران، وزارت علوم، تحقیقات فناوری.

•یار محمدیان، محمد حسین، (۱۳۹۱) شمسی. اصول برنامه درسی. تهران، یادواره کتاب.
•شریعتمداری، علی (۱۳۹۰) شمسی، جامعه و تعلیم وتربیت. تهران، امیر کبیر.

•Doll,w,e(1993) curriculum-Future, *Journal of*

Curriculum and Possibilities, No 4, pp 227-292.

•Eisner, E, W (1979). *The Educational Imagination: On the Design and*

Evaluation of School Programs, New York, Macmillan.

•ملکی، حسن (۱۳۹۵) شمسی. هویت دینی برنامه درسی؛ جستاری در نظریه اسلامی برنامه درسی. تهران، آییژ.
•ملکی، حسن (۱۳۹۵) شمسی. لزوم بازنگری مبانی فلسفی برنامه درسی/ بوم اندیشی یا گرته برداری؟. مهر نیوز
•کرمی، مرتضی؛ نجفی، حسن (۱۳۹۶) شمسی، مبانی فلسفی صدر المتالهین و استخراج مدلولهای آن برای برنامه درسی دانشگاه حکمت بنیان. تهران، دانشگاه امام حسین (ع).

•Ratcliff, G ( ). *Curriculum: Undergraduate, in: Clark, B. R & Neave*, G.

Encyclopedia of Higher Education, Oxford: Pergmaon Press

•عارفی، محبوبه (۱۳۸۴) شمسی، برنامه درسی راهبردی در آموزش عالی. تهران، جهاد دانشگاهی.
•سرمد، زهره، هژده (۱۳۷۷) شمسی. شاخصهای کیفیت برنامه درسی در آموزش عالی. فصلنامه آموزش علوم اسلامی. ش ۲۵، ۲۴، صص ۱۵۱. ۱۶۵.
•دهخدا، علی اکبر (۱۳۷۹) شمسی. لغت نامه. تهران، دانشگاه تهران.
•باتومور، تام؛ آوتوبت، ویلیام. (بیتا). فرهنگ علوم اجتماعی. تهران. نی.
•محمدی، ذکرالله (۱۳۷۳) شمسی. نقش فرهنگ و تمدن در بیداری غرب، قزوین، دانشگاه بین المللی امام خمینیؒ
•حجازی، فخرالدین (۱۳۸۳). نقش پیامبران در تمدن انسان. تهران، بعثت.
•دورانت، ویل (۱۳۶۷). تاریخ تمدن؛ مشرق زمین، گهواره تمدن. ترجمه احمد آرام و دیگران. تهران، علمی وفرهنگی.
•انوری، حسن (۱۳۸۳) شمسی، فرهنگ روز سخن. تهران، سخن.
•هانتینگتون، ساموئل (۱۳۷۳) شمسی. نظریه برخورد تمدن ها. ترجمه مجتبی امیری، تهران؛ توسعه.
•جمعی از مولفان (۱۳۷۳) شمسی. مجموعه مقالات اولین کنفرانس بین المللی فرهنگ و تمدن اسلامی. تهران: وزارت فرهنگ وارشاد اسلامی.
•تولد، و. و بار (۱۳۷۳) شمسی. بررسی مختصر فرهنگ و تمدن اسلامی. ترجمه، علی اکبر دیانت، تبریز، ابن سینا.
•تاج بخش، احمد، (۱۳۸۱) شمسی. تاریخ تمدن و فرهنگ ایران از اسلام تا صفویه. شیراز، نوید شیراز.
•زرین کوب، عبدالحسین، (۱۳۶۲) شمسی. کارنامه اسلام. تهران، امیر کبیر.
•مقام معظم رهبری (۱۳۹۱) شمسی. خراسان شمالی کے جوانوں کے ایک گروہ سے خطاب۔
•زراعت، عباس (۱۳۷۶) شمسی. راه های اسلامی کردن دانشگاه ها. فصلنامه دانشگاه اسلامی، ش ۱، صص ۵۱. ۶۴.

•علم الہدی، جمیلہ (۱۳۹۳) شمسی. نظریہ اسلامی تعلیم وتربیت. تہران، مدرسہ.
•سوزنچی، حسین (۱۳۸۸) شمسی. تاملی در بایستہ ہای تحول در علوم انسانہ، حرکت بہ سمت تحقق علوم انسانی اسلامی. فصلنامہ راہبرد فرہنگ. ش ۵، صص ۲۸، ۷.
•امین خندقی، مقصود؛ حجازی، زہرا (۱۳۹۵) شمسی. بررسی ضرورت اسلامی سازی علوم و استلزامات مرتبط باآن در حوزہ آموزش عالی. مجموعہ مقالات ہمایش بومی سازی برنامہ درسی؛ چیستی و چگونگی. تہران، دانشگاہ علامہ طباطبایی.
•محمدی، یحییٰ؛ کیحا، علی رضا و علی پور مقدم، خدیجہ (۱۳۹۵) شمسی. طراحی برنامہ درسی متعادل بارویکرد برنامہ ریزی درسی فطری و معنوی. فصلنامہ پژوہش در مسائل تعلیم وتربیت اسلامی. ش ۳۲. صص ۱۳۵.۱۰۹
•یوسف زادہ، محمد رضا؛ جمشیدی، اصغر (۱۳۹۳) شمسی. بررسی عوامل موثر بر برنامہ درسی اسلامی از دیدگاہ دانشجویان کارشناسی ارشد رشتہ برنامہ ریزی درسی دانشگاہ ہای تہران. فصلنامہ پژوہش در مسائل تعلیم وتربیت اسلامی. ش ۲۲، صص ۶۵.۷۹.
•قرآن کریم، حجرات، ۱۳.
•رفعت جاہ، مریم؛ شکوری، علی (۱۳۸۷) شمسی. اینترنت و ہویت اجتماعی. فصلنامہ رسانہ، ش ۵. ص ۱۷.۱.
•خسرو پناہ، عبدالحسین (۱۳۹۳). در جستجوی علوم انسانی اسلامی؛ تحلیل نظریہ ہای علم دینی وآزمون الگوی حکمی، جہادی در تولید علوم انسانی اسلامی. جلد ۱. قم، معارف.
•میر، محسن (۱۳۹۰) شمسی. بازخوانی انتقادی اسلامی سازی علوم انسانی از منظر اسماعیل فاروقی. فصلنامہ اسراء. ش ۲، صص ۳۷، ۷۵.
•موسوی، محمد (۱۳۹۱) شمسی. بایستہ ہای اسلامی سازی علوم انسانی از منظر سید محمد نقیب العطاس. فصلنامہ پژوہش فرہنگی و اجتماعی. ش ۱. ص ۴۲.۵۱.
•ساجدی، ابوالفضل (۱۳۹۰)۔ اسلامی سازی علوم انسانی، آسیب شناسی. ماہنامہ معرفت. ش ۱۶۷. ص ۶۱، ۷۱
•بستان، حسین (۱۳۹۵) شمسی۔ گامی بہ سوی علم دینی، ساختار علوم تجربی و امکان علم دینی. قم، پژوہش گاہ حوزہ و دانشگاہ.
•گلشنی، مہدی (۱۳۸۸) شمسی۔ از علم سکولار تا علم دینی. تہران، پژوہش گاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی.
•سوزنچی، حسین (۱۳۸۹) معنا، امکان و راہکارہای تحقق علم دینی. تہران، پژوہشکدہ مطالعات فرہنگی و اجتماعی وزارت علوم تحقیقات و فناوری.
•نجفی، موسوی (۱۳۹۴) شمسی۔ تمدن سازی در ذات انقلاب اسلامی است۔ مہر نیوز کے ساتھ گفتگو۔ ۱۳۹۴/۱۰/۲۷ شمسی۔

اسلامی تمدن، تصور، خصوصیات اور تقاضے

مؤلف: قنبر علی صمدی

مترجم: ڈاکٹر خان محمد صادق جونپوری

اسلامی تہذیب سے مراد وہ تہذیب ہے جو اسلامی تعلیمات پر استوار ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی تہذیب مسلم علاقوں میں مسلمانوں کے ذریعہ انجام دی گئی سرگرمیوں اور نتائج کا مجموعہ ہے ۔اسلامی تہذیب کا آغاز پیغمبر اسلام ﷺ کی علمی تحریک اور قرآن کریم کی مرکزیت کے ساتھ شہر مدینہ میں ہوااور بہ تدریج اس نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو متاثر کیا۔اس طرح ہم اسلامی تہذیب کے آغاز کو عالمی تہذیب کا آغاز مان سکتے ہیں۔اسلامی تہذیب کا شمار دنیا کی زندہ اور متحرک تہذیبوں میں ہوتا ہے یہاں تک کہ بہت سی قومیں کسی نہ کسی طرح سے اسلامی تہذیب سے فیضیاب ہوئی ہیں۔آج کی جدید یوروپی تہذیب بھی اسلامی تہذیب سے متاثر ہوئی ہےاور آج کا یوروپ بھی اسلامی تہذیب کے علمی خدمات کا مرہون منت ہے۔

اسلامی تہذیب کا آغاز رسول خدا ﷺ کے دست مبارک سے ہوا اور آپ نے جزیرہ عرب میں الہی تعلیمات کی بنیاد پر ایک حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ یہ حکومت اتنی وسیع ہو گئی کہ اس دور کے ایک تہائی ممالک پر محیط تھی۔ (گلی زوارہ، جغرافیای جہان اسلام، ص ۸۹-۹۶)

اس دور میں رسول خدا ﷺ نے بہت سے سیاسی، فوجی، اقتصادی اور سماجی اقدامات انجام دئے اور مختلف ادارے تشکیل پائے اور بعد میں آنے والے مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ ان اقدامات کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیا۔اسی دور میں زکات جیسے قوانین وضع کئے گئے تاکہ حکومت کے لئے مالی وسائل فراہم ہو سکیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد فتوحات کے دور کا آغاز ہوا جن کی وجہ سے اسلامی تہذیب کی جغرافیائی توسیع ہوئی اور قدیم تہذیبوں سے لین دین ہوا۔ (میکل مندرہ، اسلام و تمدن اسلامی، ص ۹۲)

اسی دور میں اسلامی تہذیب کی توسیع اور فروغ کا عمل شروع ہوااور اس کی دو وجہ تھی: ایک قرآن و سنت سے متاثر ہوتے ہوئے مسلمانوں کی علمی تحریک اور دوسرے قدیم تہذیبوں کو فتح کرنااور ان کے تہذیبی آثار پر غلبہ حاصل کرنا۔

شروع کی کچھ صدیوں تک مسلمانوں نے حصول علم کے لئے اسلام کی تاکید کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف علوم و فنون حاصل کئے ۔ جس دور میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے، مسلمان دانشوروں نے علم کے مختلف میدانوں میں نئے علمی نظریات کو فروغ دیااور مسلمانوں کی علمی تحریک یوروپ کے مغربی کنارے تک پہنچ گئی۔

ایک طرف، اسلامی معاشروں کی علمی ترقی اور دوسری طرف ، اسلامی فتوحات اور چین، ہندوستان اور ایران میں بودھ اور زرتشت کی قدیم تہذیبوں کے بکھر جانے کے بعد ،اسلامی تہذیب و تمدن، بحیرہ روم سے ہندوستان اور ایشیاء کے وسط تک پھیل گیا۔ مسلمانوں نے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی کتابوں کا ترجمہ کیا، کتب خانہ اور اسکول بنوائے اور دوسری تہذیبوں کی کتابوں کو اپنے کتب خانوں میں داخل کیااور دوسرے ممالک کے دانشوروں کو اپنے علمی اداروں میں دعوت دی، جس کے سبب اس دور کے مسلمانوں کو قدیم تہذیب اور علوم وفنون پر دسترس حاصل ہوئی۔

اس دور میں اسلامی تہذیب نے دو صدیوں کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک کو فتح کرلیااور ایشیاء، یوروپ اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں اپنی تعلیمات کو فروغ دیا اور آنے والے کئی صدیوں تک پوری دنیا میں اپنی بالادستی محفوظ کرلی۔

بعد کے دور میں ایران میں صفوی ، ہندوستان میں مغل اور ترکی میں عثمانی حکومتوں کا ظہور ہوااور اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ و ارتقاء کا نیا باب وا ہوگیا۔اگرچہ اس علمی توسیع کا آغاز خراسان اور ہرات میں تیموریوں کے دور سے ہوااور انہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو اس حد تک زندہ کیا کہ اس کی میراث عثمانی اور صفوی حکومتوں تک منتقل ہوئی۔

صفوی دور کے ایران میں مختلف فلسفی مکتب فکر (ہانری، کاربن، تاریخ فلسفہ اسلامی، ص ۴۷۶) اور محقق کرکی

اور اردبیلی جیسے فقہی مکاتب فکر کا ظہور ہوا۔ (مجلّہ فقہ اہلبیت، ش ۵۶، ص ۱۵۳) ادب اور صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ (راوندی، مرتضی، تاریخ اجتماعی ایران، ج ۸، ص ۱۱۱)

ہندوستان میں بھی مغل حکومت اور ایرانی دانشوروں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔ (موحدی، محمد رضا، اسلام در ہند، ص ۱۱۶)

اکبر شاہ کا عظیم الشان کتب خانہ، فتح پوری کی جامع مسجد، دہلی کی جامع مسجد، تاج محل وغیرہ اس دور کے اسلامی تہذیب پر گواہ ہیں۔

عثمانی حکومت، اسلامی دور کی سب سے زیادہ وسیع اور طولانی مدت کی حکومت تھی۔ اس دور کے اسلامی آثار اور خاص کر استنبول یا قسطنطنیہ کی مساجد، دار الشفاء، کاروانسرا (مسافر خانہ)، پل، حمام خانقاہ وغیرہ اس بات کے گواہ ہیں۔ (اوزون، چارلی، اسماعیل حقی،) عثمانی بادشاہ، علما اور دانشوروں کی حمایت کرتے تھے۔ امیر سلیمان چلبی کا محل علماء کا مرکز تھا۔ اس دور میں بہت سی کتابیں تحریر کی گئیں اور ان کا ترجمہ ہوا۔ (اوزون، چارلی، اسماعیل حقی، تاریخ عثمانی، ص ۶۴۰)

سلیمانیہ کی جامع مسجد، اسلامی معماری کی بہت ہی خوبصورت مثال ہے۔ جہاں اسلام کی یہ ساری تاریخی عمارتیں، مسلمان قوموں کی خاص تہذیب کی عکاس ہیں۔

اسلامی تہذیب کی یہ رونق پانچویں صدی ہجری کے اواخر تک ہی قائم رہی اور چھٹی صدی کے آغاز سے اسلامی معاشروں میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب کی رونق میں کمی آئی۔ مذہبی اختلافات اور طاقت کی جنگ ان اہم عوامل میں سے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی دنیا کی تہذیب و تمدن اضمحلال اور زوال کی طرف گامزن ہو گئی۔ عباسی خلافت اور فاطمی حکومت کے آپسی اختلاف کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں شگاف پیدا ہو گیا۔ اسی زمانہ میں کچھ ایسی قوموں کو حکومت مل گئی جن کا تہذیب و تمدن سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا اور ان کی وجہ سے اسلامی دنیا کے مشرقی علاقوں میں اسلامی تہذیب و تمدن کا زوال شروع ہو گیا۔ مثال کے طور پر ترکی خاندان سے تعلق رکھنے والے غز قبیلہ نے مرو، طوس، نیشابور، خوارزم اور بہت سے ایسے مراکز کو ویران کر دیا جو خراسان میں علم و تہذیب کا گہوارہ شمار کئے جاتے تھے۔ (براون، ادوارد، تاریخ ادبیات ایران از فردوسی تا سعدی، ص ۸؛ تاریخ ایران از آغاز تا انقراض

سلسلہ قاجاریہ، ص۳۶۱)

اسی طرح مغلوں نے جہان اسلام کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا اور اسلامی تہذیب کے آثار کو اس طرح ختم کردیا کہ اس علاقے میں ایک عرصہ تک علم و دانش کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی اور زیادہ تر لوگ بادیہ نشین ہوگئے۔ (عبدالرحمان، بن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۱۵۲) اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مصر و شام کے علاوہ اسلامی دنیا کے بیشتر علاقے اس زوال کی زد میں آگئے۔

گذشتہ صدیوں میں اسلامی معاشرے میں انگریزوں کی استعماری طاقت کے ظہور کے بعد مسلمانوں کی طاقت میں کمی آئی اور اسلامی ممالک کی تہذیب، صلیبی جارحیت اور مغربی ممالک کی تبدیلیوں کی زد میں آگئی۔ ایران، ہندوستان اور ترکی میں اسلامی حکومت کے خاتمہ اور مغربی ممالک کے سیاسی اور تہذیبی حالات اسلامی تہذیب کو زوال کی طرف لے گئے۔

اسلامی ممالک کے سربراہوں کا ظالم طاقتوں پر شدید انحصار اور اسلامی معاشروں کا مغربی تہذیب سے متاثر ہونا سبب بنا کہ، جمود اور زوال کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہے۔ یہاں تک کہ عصر حاضر میں علماء اور دانشوروں کی کوششوں سے اسلامی بیداری کی ایک لہر دنیائے اسلام میں پیدا ہوئی اور خاص کر ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد، اسلامی تہذیب و تمدن کے احیاء کی کوششیں تیز ہوگئیں۔ امید ہے یہ تحریک جس کا آغاز اسلامی انقلاب سے ہوا ہے، ایک عالمی اسلامی تہذیب کی تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

اسلامی تہذیب کے خصوصیات

اسلامی تہذیب اپنی ماہیت اور ذاتی خصوصیات کی وجہ سے خود کو معاشرہ کے متغیر حالات پر منطبق کرسکتی ہے۔ بشری نقطہ نظر سے اسلامی تہذیب کے کئی پہلو ہیں۔ اسلامی تہذیب علمی، مستقبل اندیش، اور نظریات پر منحصر ہے۔ اسلامی تہذیب آغاز سے انتہا تک، بامقصد اور منظّم طریقے سے آگے بڑھتی ہے اور اس کے ارتقا کا آخری مرحلہ مہدوی تہذیب ہے۔ یہاں پر ہم اسلامی تہذیب کے بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ کثیر جہتی تہذیب: اسلامی تہذیب کی پہلی خصوصیت کثیر جہتی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے تہذیب بنتی ہے لہٰذا تہذیب کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انسان اور اس کے وجود

کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھیں۔اسلامی تہذیب انسان کی مادی و معنوی ضرورتوں پر مرتکز ہوتی ہے ۔انسان کی ضرورتوں کو کلی پر طور مادی اور معنوی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔اسلامی تہذیب، انسان کی مادی اور معنوی دونوں ضرورتوں کو پوری کرنے پر تاکید کرتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے دین و دنیا کا نہ صرف آپس میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے سے مرتبط اور وابستہ بھی ہیں لہٰذا اسلامی تہذیب انسانی حیات کی جاودانگی پر تاکید کرتے ہوئے اس کی معنوی ضرورتوں کو پورا کرنے پر زیادہ زور دیتی ہے اور مادی ضرورتوں کی اہمیت صرف اسی حد تک ہے کہ وہ انسان کی معنوی پرورش میں معاون ثابت ہو۔

قرآن کریم نے بھی اس موضوع پر تاکید کی ہے کہ انسان اپنی مادی اور معنوی دونوں ضرورتوں کو پوری کرنے کا اہتمام کرے۔(سورہ قصص، آیت ۷۷)

اسلامی تعلیمات میں اگرچہ متاع دنیا کو اخروی خیر کے مقابلہ میں بہت کمتر بتایا گیا ہے(آل عمران، ۱۸۵) لیکن حیات اخروی کے حصول کے لئے دنیاوی نعمتوں اور وسائل کی اہمیت پر تاکید بھی کی گئی ہے۔

احادیث میں بھی دنیا کو آخرت کی کھیتی بتایا گیا ہے: قَالَ رَسُولُ اللهِ : اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ۔(مراۃالعقول فی شرح اخبار آل الرسول، ج۱۰، ص ۶۵)

اور آخرت کی ختم نہ ہونے والی نعمتوں کو اس دنیا میں انسان کی سعی وتلاش کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔

امام رضا (ع) فرماتے ہیں:

اِجْعَلُوا لِاَنْفُسِكُمْ حَظّاً مِنَ الدُّنْیا بِاِعْطَائِهَا مَا تَشْتَهِی مِنَ الْحَلالِ وَ مَا لَمْ یَنِلِ الْمُرَوَّةَ وَ لَا سَرَفَ فِیه وَ استَعِینُوا بِذٰلِكَ عَلی اُمُورِ الدِّینِ فَاِنَّهٗ نروِی لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَرَكَ دُنْیَا لِدِیْنِه وَ دِیْنَه لِدُنْیا ۔(الفقه المنسوب الی الامام الرضا، ص ۳۳۷)

اسلامی تہذیب، صالح انسانوں اور مثالی معاشرہ کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے ۔ایسا معاشرہ جس میں لوگ مادی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی کمالات اور انسانی فضائل کو حاصل کر سکیں۔اسلامی تہذیب ، عدالت ، تحفظ اور کرامت انسانی کی تہذیب ہے۔اسلامی تہذیب میں انسان کی کامیابی اور ترقی صرف مال وثروت اور مادی نعمتوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے مادی اور معنوی دونوں پہلوؤں کے رشد و نمو پر منحصر ہوتی

ہے۔اس کے بر عکس نئی مادی تہذیب اور خاص کر مغربی تمدن میں صرف ایک ہی پہلو پایا جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی مادی ترقی و پیشرفت۔اس کا قہری نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی ذات سے غافل ہو جاتا ہے ۔

۲۔اسلامی تہذیب، مستقبل پر مبنی تہذیب: کسی بھی تہذیب کی تشکیل میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کے مستقبل کے بارے میں اس کے کیا منصوبے ہیں۔اسلامی تہذیب کی مکمل مثال ''مہدوی تہذیب'' ہے لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تہذیب ذاتی طور پر انسانوں کے مستقبل سے متعلق ہے۔اسلامی تہذیب، قرآن کریم کی تعلیمات کی بنیاد پر مستقبل کا ایک جامع اور مستقل خاکہ پیش کرتی ہے۔ مستقبل کے حوالے سے قرآن کریم کا لائحہ عمل اگرچہ دوسرے ادیان ابراہیمی سے مشابہ ہے لیکن اس میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔قرآن کریم میں اسلامی ایمان کی کامیابی (سورہ توبہ، ۳۳) صالحین اور متقین کا یقینی غلبہ (انبیا، ۱۰۵)، ظالموں اور جابروں کا خاتمہ (قصص، ۶-۵) اور بشریت کے روشن مستقبل کے بارے میں بتایا گیا ہے جو یقینی اور حتمی ہیں۔قرآنی نقطہ نظر کے مطابق مہدوی تہذیب ، عالم انسانیت کے لئے ایک مثالی تہذیب ہے۔

۳۔علم۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد: اسلامی تہذیب علم و دانش کی بنیاد پر استوار ہے ۔ایسا علم جو عصر ظہور کے معاشرہ کے مختلف پہلوؤں پر محیط اور انسان کو ترقی و کامیابی کی طرف گامزن کرے۔دین اسلام میں علم اور حصول علم کی بہت اہمیت ہے اور اسی وجہ سے اسلامی تہذیب ، علم و پیشرفت کی تمام بلندیوں کو فتح کر سکتی ہے اور اس ارتقاء کو ہم مہدوی تہذیب کے آئینہ میں بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ عصر ظہور میں امام مہدی (عج) کی الٰہی قیادت کے زیر اثر انسانی معاشرہ کی علمی پیشرفت و ترقی اپنے بام عروج پر پہنچ جائے گی اور انسان اپنی معنوی ضروریات کی شناخت کے بعد مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لئے مادی و معنوی ترقی کے زینوں کو طے کرے گا۔

امام جعفر صادق (ع) اس سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں: اَلْعِلْمُ سَبْعَةٌ وَ عِشْرُوْنَ حَرْفاً فَجَمِيْعُ مٰا جَاءَتْ بِهِ الرُّسُلُ حَرْفانِ فَلَمْ يَعْرِفِ النَّاسُ حَتّٰى اليَومِ غَيْرَ الْحَرْفَيْنِ فَاِذَا قَامَ قَائِمُنٰا اَخْرَجَ الْخَمْسَةَ وَ العِشْرِيْنَ حَرْفاً فَبَثَّهَا فِي النٰاسِ وَ ضَمَّ اِلَيْهَا الْحَرْفَيْنِ حَتّٰى يَبُثُّهَا سَبعةً وَ عِشْرِيْنَ حَرْفاً ۔(بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۳۶؛ معجم احادیث الامام المہدی، ج ۴، ص ۵۵)

علم ۷۲ حرف ہیں لیکن عصر ظہور تک سارے پیغمبروں نے جو کچھ بشریت کے حوالے کیا وہ صرف دو حرف ہے۔ جب ہمارا قائم قیام کرے گا تو دیگر ۷۲ حروف کو بھی ظاہر کرے گا۔

عصر ظہور میں مدینہ فاضلہ، اسلامی مدینہ العلم ہے۔ اس منجی حقیقی کے ظہور کے بعد جس طرح ظلم و ستم کی جگہ عدل وانصاف قائم ہوگا اسی طرح جہل و نادانی کی جگہ علم و فہم آ جائے گا۔

احکام دین کے فہم و درک کے سلسلہ میں بھی نئے علوم و فنون کے انکشاف کے بعد خاصی تیزی آئے گی اور احکام و مسائل شرعی میں سبھی صاحب نظر ہو جائیں گے۔ امام محمد باقر (ع) فرماتے ہیں: "تُؤْتُونَ الْحِكْمَةَ فِي زَمَانِهِ حَتَّى اَنَّ الْمَرْاَةَ لتَقْضِي فِي بَيْتِهَا بِكتَابِ اللهِ وَ تَعَالٰى وَ سُنَّةِ رَسُولِ الله۔" (الغیبۃ نعمانی، ص ۲۳۹، بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۵۲) عصر ظہور میں علم و دانش اتنا ترقی کرے گا کہ خواتین اپنے گھروں میں کتاب خدا اور سنت رسول (ص) سے فیصلے کریں گی۔

عصر ظہور میں لوگوں کی جسمانی حالت بھی تبدیل ہو جائے گی۔ اور بیماروں کو شفاء ملے گی اور بیماریوں پر قابو پالیا جائے گا اور موت میں کمی واقع ہو گی۔ امام صادق (ع) ارشاد فرماتے ہیں: اِذَا قَامَ الْقَائِمُ اَذْهَبَ اللهُ عَنْ كُلِّ مُؤْمِنٍ الْعَاهَةَ (الغیبۃ، نعمانی، ص ۳۱۷) جب قائم قیام کرے گا، اللہ تعالی ہر مؤمن کو بیماری اور کمزوری سے دور کرے گا اور تندرستی و سلامتی عطا کرے گا۔

عصر ظہور میں طبّی سہولیات اور حفظان صحت کی وجہ سے لوگوں کی عمر میں اضافہ ہوگا۔ مفضل نے امام صادق (ع) سے نقل کیا ہے کہ: اِنَّ قَائِمَنَا اِذَا قَامَ اَشْرَقَتِ الاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَ اَسْتَغْنٰى الْعِبَادُ عَنْ ضَوءِ الشَّمْسِ وَ ذَهَبَتِ الظُّلْمَةُ وَ يُعَمِّرُ الرَّجُلُ فِي مُلْكِهِ حَتّٰى يُوْلَدَ لَهُ اَلْفُ ذَكَرٍ لَا تُولَدُ فِيهِم اُنْثٰى۔ جب ہمارا قائم ظہور کرے گا زمین اپنے پروردگار کے نور سے منور ہو جائے گی یہاں تک کہ لوگ سورج کی روشنی سے بے نیاز ہو جائیں گے اور تاریکی ختم ہو جائے گی اور آنحضرت کی حکومت میں انسان اتنی عمر کرے گا کہ اس کے ہزار بیٹے ہوں گے۔ (الارشاد، ج ۲، ص ۳۸۱؛ الغیبۃ طوسی، ص ۴۶۸)

منابع و مآخذ

۱۔قرآن کریم

۲۔ گلی زوارہ، غلام رضا، جغرافیای جہان اسلام، آشنایی باکشور ہای اسلامی و قلمرو اقلیت ہای مسلمان، قم، موسسہ آموزش وپژوھشی امام خمینی، چاپ اول، ۱۳۸۵

۳۔مائیکل منڈرہ، باہمکاری ھانری لوران، اسلام وتمدن اسلامی، ترجمہ حسن فروغی، تہران، سازمان مطالعہ وتدوین کتب علوم انسانی، دانشگاہ ھا (سمت) چاپ اول، ۱۳۸۱

۴۔ راوندی، مرتضٰی، تاریخ اجتماعی ایران، بخش دوم، تہران، انتشارات نگاہ، چاپ دوم، ۱۳۸۲ش

۵۔ موحدی، محمد رضا، اسلام در ھند، قم، مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفٰی، چاپ اول، ۱۳۹۰

۶۔اوزون چارلی، اسماعیل حقی، تاریخ عثمانی، ترجمہ وہاب ولی، تہران، پژوھشگاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی، چاپ اول، ۱۳۸۰

۷۔ براون، اڈوارڈ، تاریخ ادبیات ایران از فردوسی تا سعدی، ترجمہ فتح اللہ مجتبائی وغلام حسین صدری افشار، تہران، مروارید، چاپ چہارم، ۱۳۶۷

۸۔ مجلسی، محمد باقر، مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسول (ع) ، تصحیح: سید ھاشم رسولی محلاتی، چاپ دوم، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۴ھ

۹۔ موسسہ آل البیت (ع)، الفقہ المنسوب الی الامام الرضا علیہ السلام، منسوب بہ علی بن موسیٰ، امام ھشتم (ع) ، مشہد، ۱۴۰۶ھ

۱۰۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، مصحح و محقق: جمعی از محققان، چاپ دوم، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۳ھ

۱۱۔ نعمانی، محمد بن ابراہیم، الغیبۃ، مصحح: علی اکبر غفاری، تہران، مکتبۃ الصدوق، چاپ اول، ۱۳۹۷ھ

۱۲۔ طوسی، محمد بن الحسن، الغیبۃ للحجۃ، محقق و مصحح: عباد اللہ تہرانی و علی احمد ناصح، قم، دار المعارف الاسلامیہ، چاپ یکم، ۱۴۱۱ھ

۱۳۔ مفید، محمد بن محمد بن النعمان العکبری، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، تحقیق: موسسہ آل البیتؑ، چاپ یکم، قم، کنگرہ شیخ مفید، ۱۴۱۳ھ

۱۴۔ عبد الرحمٰن بن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ: محمد پروین گنابادی، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، چاپ دوازدہم، ۱۳۸۸

بین الاقوامی قانون میں اسلامی۔انسانی حقوق کی معیاری قبولیت

گروہ مؤلفین: سیامک کرم زادہ[۱]

مسعود علیزادہ[۲]

مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری

خلاصہ

انسانی حقوق کے قواعد اور اسلامی فقہ کا ارتباط ہمیشہ بین الاقوامی سطح پر موضوع بحث رہا ہے۔ یہ بحث دو اعتبار سے حقوق دانوں کی توجہ کا مرکز قرار پا سکتی ہے۔ ایک داخلی اعتبار سے خصوصاً ان ممالک میں کہ جن کے داخلی حقوق کسی نہ کسی اعتبار سے اسلامی دستورات و قواعد کے تحت تاثیر ہیں۔ دوسرے بین الاقوامی حقوق کے اعتبار سے اور وہ اس طرح کہ حقوق بشر اور اسلامی فقہ میں کہاں اور کس حد تک توافق و ہم آہنگی ہے یا کہیں کس قدر تضاد و تناقض ہے۔ زیر نظر مقالہ اس موضوع پر ایک تاریخی نگاہ کے ساتھ اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بین الاقوامی حقوق اگرچہ شروع میں دین و سیاست میں تفکیک و تفریق کی ایک کوشش کے طور پر پیش کئے گئے تھے۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت، دینی دستورات اور حقوق انسانی کے درمیان ایک توافقی نظریہ قائم کرنے میں مانع نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی حقوق میں انسان کے حقوق کے جو خاص قواعد ہیں ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قواعد میں نوے فیصد سے زیادہ توافق و یکسانیت ہے۔ اور چند جگہوں پر ان دونوں دستوروں میں ایک قسم کا اختلاف ہے۔ اسلام اور معاشرہ میں رائج بین الاقوامی نظم و نسق میں مختلف اصولوں کے وجود نے اس اختلاف کو کافی حد تک کم کر دیا ہے۔ اور آئندہ اس اختلاف کی شرح کو جو چیز اور کم کرے گی یا اس دو رخی کو گھٹائے گی، وہ فقہ اسلام کے علماء اور بین الاقوامی حقوق کے دانشوروں اور حقوق دانوں کے درمیان ایک پائیدار وشائستہ گفتگو ہے۔

۱۔ اسسٹنٹ پروفیسر انٹرنیشنل لاء شاہد یونیورسٹی۔ ایمیل: skkaramzadeh@gmail.com

۲۔ اسسٹنٹ پروفیسر انٹرنیشنل لاء پیام نور یونیورسٹی۔ ایمیل: massoud.alizadeh1@gmail.com

مقدمہ

انسانی حقوق کا مسئلہ آج ایک سنجیدہ سیاسی روابط کے بین الاقوامی موضوع کو کچھ اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ تمام ممالک خصوصاً اسلامی ممالک ایک طرح سے اس میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بین الاقوامی حقوق کی مشکل یا اسلامی حقوق کا شائستہ ہونا سیاسی و علمی حلقوں میں گرما گرم بحث کا موضوع رہا ہے۔ یہ جنگ اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ مغرب میں حقوق انسانی کے بعض تخصصی و خصوصی محکموں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی احکام اور مغرب کے حقوق انسانی میں کوئی توافق و ہم آہنگی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کی عدالت نے ''حزب رفاہ'' کے معاملہ میں اپنے مشہور فیصلہ میں عملی طور پر اسلام اور اسلامی شریعت اور یورپ کے انسانی حقوق میں کسی بھی توافق کا انکار کیا ہے۔[1]

فلسفی نگاہ سے آج مغرب میں اسلام اور انسانی حقوق کے درمیان تصور کائنات کا جو فرق محسوس کیا جاتا ہے اور جسے تسلیم بھی کیا جاتا ہے، اس کی ایک فلسفی و تاریخی بنیاد ہے۔ یہ تعارض و ٹکراؤ کبھی اس حد تک بھی پہنچا ہے کہ بعض لوگوں نے انسانی حقوق کے عالمی مفہوم کو فقط ایک مفہوم ہی تصور کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ''غرب پرستی'' مغرب کی تہذیب کی دین ہے اور دنیا کی تہذیبوں کے اختلاف سے ایک قسم کی بے خبری کی دلیل ہے۔ یہی نظریہ متعدد مواقع پر اس بات کا سبب بنا کہ اسلامی ممالک بین الاقوامی حقوق و قوانین کے قواعد کو شک کی نگاہ سے دیکھیں اور جب بین الاقوامی اداروں میں انسانی حقوق کی شقیں منظور ہوتی ہیں اس وقت اسلامی ممالک ان قواعد کی بہ نسبت خدشہ واحتیاط کے حق سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کبھی چیلنج کی حالت میں اپنا مخصوص آرٹیکل اسلامی حقوق بشر کے عنوان سے فراہم کرتے ہیں۔[2]

۱۔ CEDH, Affaire Refah partisi et autres c, Turquie, 31/07/2001, available in: https://hudoc.cchr.coc,int/eng#{"dmdocnumber": ["702044"], "itemid":["001-64174"]}

۲۔ ان اسناد کے بارے میں نمونہ کے طور پر درج ذیل کتابوں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔
طرح اعلامیہ حقوق بشر و تعہدات بنیادین انسان در اسلام، تہیہ شدہ از سوی اتحادیہ جہان اسلام در سال ۱۹۷۹۔
اعلامیہ جہانی اسلام، تہیہ شدہ از سوی شورای اسلامی لندن مورخ ۱۲ آپریل ۱۹۸۰۔ بقیہ اگلے صفحہ پر

یہ حالات اس بنیادی ضرورت کو پیش کر سکتے ہیں کہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قواعد کو قبول کرنے کی کیفیت کا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔ اس مطلب کو پیش کرنے سے قبل اس حقیقت کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بہت سے اسلامی دانشور انسانی حقوق کے مفہوم و نظریہ کے تجزیہ میں جو چیز اصول و مبانی میں انسانی حقوق کے عنوان سے معروف ہے اسے مغربی تمدن کی فکر کا امتداد و تسلسل قرار دیتے ہیں[۱]۔ ان مفکرین کے نقطۂ نظر سے اسلامی حقوق بشر کا فلسفہ کلی طور پر مغرب کے اصول سے جدا ہے اور اسی چیز نے حقوق بشر کے بارے میں اسلامی و مغربی دو نظریوں کے درمیان کم و کیف کے اختلاف کو وجود دیا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ غلط نہیں ہے۔ اس نظریہ میں یہ بات یاد دلادیں کہ اول تو اسلامی حقوق بشر میں دیگر تمام حقوق کی مانند حقوق الٰہی کا پہلو ہے اور آسمانی مقنن (خدا) نے انہیں وجود دیا ہے۔ دوسرے ان حقوق کے اصولوں کو انسان کو دی جانے والی تکالیف کے ساتھ بیان کیا جانا چاہئے۔ اور ان کا تجزیہ کیا جانا چاہئے۔ اسی زاویہ میں اسی نکتہ کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے کہ جن پانچ مصالح کی حمایت کے لیے ہر قسم کی قانون سازی و قانون گزاری کی بنیاد رکھی گئی ہے وہی فرد و معاشرہ کی حمایت کی بنیاد کو تشکیل بھی دیتے ہیں اور وہ

اعلامیہ جہانی اسلامی حقوق بشر کہ توسط شورای اسلامی لندن تہیہ گردید و در ۱۹ ستمبر ۱۹۸۱ بہ یونسکو ارایہ گردید۔

پیش نویس سند راجع بہ حقوق بشر در اسلام کہ در جریان اجلاس سران سازمان کنفرانس اسلامی در ۱۹۸۱ در طائی ارائہ گردید۔

پیش نویس سند راجع بہ حقوق بشر کہ در پنجمین نشست حقوق بشر در دسمبر ۱۹۸۹ تہران بہ تصویب رسید۔

پیش نویس اعلامیہ حقوق بشر در اسلام کہ توسط وزرای خارجہ اعضای سازمان کنفرانس اسلامی در اکتوبر ۱۹۹۰ در قاہرہ تہیہ گردید.

پیش نویس منشور عربی حقوق بشر کہ توسط کشورہای عضو اتحادیہ عرب در سال ۱۹۸۲ تہیہ شد.

طرح منشور حقوق بشر و مردم در جہان عرب کہ در دسمبر ۱۹۸۶ بہ تصویب رسید۔

کتاب سبز حقوق بشر در عنہاد جماہیری کہ در ۱۲ جون ۱۹۸۸ توسط لیبی بہ تصویب رسید۔

در مورد بررسی تفصیلی این استاد نگاہ کنید بہ:

-MOTILLA, A (ed.), Islam y Derechos Humanos, Madrid, Trotta, pp. 27-52.

۱۔ محمد عمارہ، معرکہ المصطحات بین الغرب والاسلام، نہضہ مصر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ص ۸۸

نفس، دین، عقل اور آبرو، ومال سے عبارت ہیں۔[۱] حقوق بشر کے تجزیہ میں اسی کلی فرق نے اسلامی اصولوں اور غربی بین الاقوامی حقوق بشر کے نظریہ میں شگاف پیدا کیا۔ یہ اختلاف پہلی نظر میں قابل اعتناء معلوم ہوتا ہے۔ آخری تجزیہ میں موجودہ بین الاقوامی حقوق کے اصولوں سے نسبی واضافی توافق تک رسائی کی جاسکتی ہے۔ (پہلی بات)، اسلام میں حقوق بشر کے اصولوں اور موجودہ بین الاقوامی حقوقی نظام کے اختلاف سے قطع نظر ہماری دونوں باتوں کے مواد و محتویٰ میں کوئی خاص ٹکراؤ اور تعارض نہیں ہے۔ اس راہ میں جو اسناد غیر حکومتی یا بین الاقوامی اداروں میں تنظیم پائی ہیں ان کے مواد و محتویٰ کے منطقی تجزیہ کو اس محتویٰ خوانی کی دلیل سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلامی قواعد کی تنظیم اور بین الاقوامی وضع شدہ حقوق کے درمیان جو متن و محتویٰ کے تعارض و ٹکراؤ ہیں ان کے آخری حل کے لیے لمبا راستہ درپیش ہے (دوسری بات)۔

پہلی بات: اسلام میں حقوق بشر اور بین الاقوامی حقوق کی تنظیم: تعارض سے توافق تک

ثابت و تغیر ناپذیر حقوقی اصولوں کا تجزیہ انسان کے سامنے اسلام اور بین الاقوامی حقوق کی تنظیم کے دو مختلف راستے پیش کرتا ہے، بہر حال بین الاقوامی حقوق کی تنظیم وترتیب نے اپنی جدید ویورپین تدوین کی راہ میں ہر چیز سے زیادہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ پہلے سے معین شدہ ماورائے طبیعت کے دستورات سے الگ ہٹ کر "انسان دوستی" کی بنیاد پر اپنے قواعد کی تدوین کرے۔ بنیادی طور پر اسلامی فکر ہر قسم کی قانون سازی خدائی اصولوں اور اس کی مشیت کی بنیاد پر کرتی ہے۔ (الف)، ان تمام باتوں کے باوجود یہ تقابل (نظری تعارض) آخری تجزیہ میں "مقصدی تفاہم" انسان کی حمایت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ (ب)

الف: وضع شدہ حقوق بشر کے اصول اور اسلام

جدید بین الاقوامی حقوق کی تاریخ کے سفر کی تحقیق و تجزیہ ہر چیز سے پہلے ایک قسم کی جدائی کو بیان کرتا ہے۔ اور وہ ہے آسمانی قواعد سے حقوق کی جدائی، جس دنیا میں بین الاقوامی حقوق کے بنانے والوں نے تنظیم حقوق کی بنیاد رکھی ہے، شاید مشکل اور اہم ترین کام، پاپ کی طاقت، یعنی اس طرح دنیا پر اس کی مذہبی فرمانروائی و حکمرانی کو

۱۔ ایضاً، ص ۸۹

ختم کرنا تھا چنانچہ ہسپانوی مسیحی حقوق دان (ویٹوریا) پاپ کو فقط ایک ایسا "روحانی" پیشوا تسلیم کرتا ہے، جس کی کوئی زمین نہیں ہے اور اس کی زمینی طاقت کا انکار کیا جانا چاہئے، اسی نظریہ میں یہ بھی ہے کہ برسوں بعد، دہائیوں کے بعد مستقل حیثیت سے خود مختار ہونے اور بین الاقوامی حقوق بنانے کی تاکید کی گئی۔اس سلسلہ میں جدید بین الاقوامی حقوق کے علماء حقوق کا اتفاق ہے کہ پاپ کی طاقت محدود کرنے اور آسمانی طاقت سے زمینی طاقت کو جدا کرنے کے نظریہ نے مرور زمانہ کے ساتھ لکھنے والوں کے لیے نیا راستہ کھولا ہے تاکہ وہ گزرتے زمانہ کے ساتھ بین اقوامی حقوق کو مذہب سے جدا کر سکیں اور انہیں ایک غیر مذہبی اور مستقل علم کی صورت دے سکیں۔[۱]

بین الاقوامی حقوق کی تشکیل کے لیے "ویٹوریا" نے جو راستہ کھولا تھا ایک مدت گزر جانے کے بعد اس پر "ویٹوریا" کے ہم وطن حقوق داں "سوارز" گامزن ہوئے اور "جنٹیلی" کی فکر کے قالب میں مکمل ہوا۔ بین الاقوامی حقوق کی تاریخ کی تدوین میں، آلبریکوس جنٹیلی کے نظریہ کو بین الاقوامی حقوق کی تشکیل کا نقطۂ آخر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ خود کو ہر دینی فکر سے آزاد اور خود مختار سمجھتا تھا۔[۲] بین الاقوامی حقوق کی کلاسیکی تاریخ کا آج اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ "جنٹیلی" بین الاقوامی حقوق کی تشکیل میں اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے مذہب کو بین الاقوامی حقوق سے الگ رکھا ہے۔ "جنٹیلی" کا یہی نظریہ اس قانون کی تنظیم وترتیب کا محرک بنا ہے جسے آج بین الاقوامی حقوق کا نام دیا جاتا ہے:

"silete Theologi in Mune alieno"[۳]

۱۔ پرویز ذوالعین، میانی حقوق بین الملل عمومی، دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی، تہران ۱۳۸۳، ص ۳۶۴۔

۲۔ اے پادریو! چپ رہو اور اس معاملہ میں دخل اندازی نہ کرو جو تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ جدید بین الاقوامی حقوق کی تشکیل کے بارے میں جنٹیلی کے غیر مذہبی نظریہ کے تجزیہ کے لیے ملاحظہ ہو۔

Giovanni Minnucci, Silete Theologi in munere alieno, Alberto Gentili tra diritto, teologia e religion, Monduzzi. 2016

۳۔ پرویز ذوالعین، پیشین، ص ۳۹۳۔۳۹۲۔

گروسیوس کہ جس کو بین الاقوامی حقوق کا باپ کہا جاتا ہے۔ جس نے اپنے اکثر نظریات جنٹیلی سے ہی لیے تھے اس نے بھی حقوق کی دین سے جدائی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنیادی طور پر حقوق دو ہی ہیں: فطری حقوق اور ارادی حقوق۔

فطری حقوق فطرت ہی سے وجود میں آتے ہیں وہ کسی ارادہ کی پیداوار نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں خدا کا ارادہ بھی نہیں بدلتا ہے کیونکہ فطرت کا خالق بھی خدا ہی ہے اسی لئے اس کی لامتناہی قدرت اس کے خلاف نہیں جاتی۔ جس طرح ۴ = ۲x۲ ہی ہوگا نہ اس سے کم اور نہ زیادہ، لیکن ارادی حقوق جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ ارادہ سے وجود میں آتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خدا کے ارادہ سے وجود میں آتے ہیں اور دوسرے وہ جو انسان کے ارادہ سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ گروسیوس اسی چیز کو خدائی حقوق جانتا ہے جو کتاب مقدس میں بیان ہوئی ہے اور اس کے بالمقابل حقوق انسانی کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: شہری حقوق، خاندانی حقوق اور بین الاقوامی حقوق۔[1]

اس اعتبار سے بین الاقوامی حقوق خدا کے ارادہ سے علیحدہ ایک چیز ہے اور ایک ایسا نظام ہے جو تمام حکومتوں یا اکثر حکومتوں کے ارادہ سے اپنی طاقت حاصل کرتا ہے۔ ایسی تعریف اس فکر کے بالمقابل ایک نظریہ ہے جو حق کو فقط خدا کے ارادہ کی پیداوار قرار دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تجزیہ میں خدائی دستور کے عنوان سے ایک چیز آتی ہے جو کہ یکتا پرستی پر موقوف ہے اور وہ یہ کہ قانون بنانے کا حق صرف خدا کو ہے۔ اسلامی مذہب میں کہا گیا ہے کہ "کائنات اور انسان کا حاکم مطلق خدا ہے"[2] اور اس عقیدہ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ "آفرینش کا سارا نظام خدا کی طرف سے ہے اور کائنات کا عظیم کارخانہ خدا نے ہی بنایا ہے۔"[3] اس سے بہتر لفظوں میں یہ کہا جائے کہ اسلامی خدائی کارخانہ میں

۱۔ پرویز ذوالعین، پیشین، ص ۳۹۳۔۳۹۲۔

۲۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ یوسف، ۴۰)

۳۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا۔ (سورہ نساء، ۱۲۶)

خدا کا حکم چلتا ہے۔ اور وہ حق کے ساتھ حکمرانی کرتا ہے اور وہ بہترین حاکم ہے۔ اس بارے میں قرآن کی صریح آیتوں کا ایک مجموعہ موجود ہے جو دین اسلام کے اس نظریہ کو بیان کرتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ. (سورہ انعام، ۵۷)

خدا کے حکم کے علاوہ کوئی حکم نہیں ہے وہ حق ہی کہتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (سورہ کہف، ۲۶)

یہ آیت صریح طور پر کہہ رہی ہے کہ لوگوں کا ولی وسرپرست خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو ہرگز شریک نہیں کرتا ہے۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ (سورہ مومن، ۱۲)

حکم تو بلند و برتر خدا ہی کا ہے۔

اس سلسلہ میں قدرت معاشرہ کے لیے اس قانون کو بہترین قانون قرار دیتی ہے جو خدا نے بنایا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (سورہ مائدہ، ۵۰)

اور جو قوم اللہ پر ایمان رکھتی ہے اس کے نزدیک قانون بنانے کے لیے اللہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟
زمان و مکان کا طویل فاصلہ، گردش زمانہ اور جگہ کی تبدیلی، اس حکم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی کیونکہ اسلامی عقیدہ کی بناء پر یہ قانون حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ تمام لوگوں کو قیامت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے: " وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ " (سورۂ انعام ۱۹) (یہ قرآن وحی کے ذریعہ میرے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پہنچے اسے خدا سے ڈراؤں)۔
البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق اسلام کے قوانین کو مکمل اعتدال کے ساتھ اس طرح انسانی فطرت و شرست کے مطابق بنایا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ انسان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔
اس ترتیب سے جو چیز پہلی ہی نظر میں ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی حقوق و قواعد اور بین الاقوامی حقوق سازی کے اصولوں کے درمیان تقابل و تجزیہ کیا جائے، "عظمت انسانی" پر ساری توجہ کے باوجود اور حقوق

وضوابط کے ان دونوں نظاموں میں انسان کا جو بلند مقام ہے وہ اسلام میں حقوق بشر اور بین الاقوامی حقوق کے موضوعات کی ہم آہنگی ونزدیکی کے لیے میدان ہموار کرسکتا ہے۔

ب: تعارض نظری سے مقصدی تفاہم تک

رنسانس کے زمانہ سے یورپ والوں کی دینی افکار سے علیحدہ قانون سازی دوفکری تحریکوں کی روشن خیالی کا سبب ہوئی:

الف) خارجی ومادی مظاہر کی طرف تمایل (ایک قسم کے میٹریلزم کی طرف رجحان) جو مختلف صورتوں میں مغرب کے بعد والے فلاسفہ کے آثار میں نظر آتا ہے۔

ب) انسان کو قانون کے محور پر لانے کے لیے قانون سازی کی کوشش۔

یہ تمایل واضح طور پر "انسانی ہمدردی" یا "انسان دوستی" کی تحریک میں نظر آتا ہے اور اسی چیز نے یورپ کے جدید معاشرہ کی تشکیل میں آج بین الاقوامی حقوق کے محرک کے عنوان سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسان دوستی اس نظریہ کے مطابق کہ انسان بہت سی صلاحیتوں کا حامل ہے وہ علم وآگہی اور احساس ذمہ داری کے سبب اپنی ترقی کا میدان خود ہموار کرسکتا ہے وہ انسان دوستی اور قانون سازی پر زور دیتا ہے۔ اسی فکر میں کچھ نظریات ہیں جیسے ارادہ کی آزادی، سادہ لفظوں میں خود مختاری، دوسروں کے افکار و نظریات کا استقبال اور کائنات کو سمجھنے کے لیے اپنے بنیادی ترین اصول بنائے گئے ہیں۔ یہ خود ساختہ اصول واقدار ایک کلیدی نظریہ تھا اور وہ یہ کہ انسان اور اس سے وابستہ تمام اقدار دوسرے تمام اعتبارات وفرضیات پر فوقیت رکھتے ہیں۔[1]

اس تاریخی سیاق میں خلق اور اجتماعی دستورات وقواعد کی تفسیر کے ساتھ ارتباط کے نظریہ سے Humanism یا حقوق انسان دوستی کا نظریہ پیدا ہوتا ہے جس کو قرون وسطیٰ کے حقوق کے مفسرین کے خلاف ایک قسم کا انقلاب

۱۔ یہ ایک اصطلاح ہے جسے پروفیسر میری دلماس مارتی نے مغربی انسان دوستی کے مفہوم کی تعریف میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

Mireille Delmas-Marty. L'humanisme juridique entre Mythe et Utopie, available in http//www.tout-monde .com/sites/mireille-delmas-marty---127 humanisme-juridique-entre-mythe-et-utopie.pdf.

تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ قرون وسطیٰ کے حقوق کے مفسرین اور حقوقی حاشیہ نویسوں نے عیسائی خدائی حقوق پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی پوری کوشش نصوص کی شکلی تفسیر کرنے میں صرف کی ہے جس سے ''حقوق انسان دوستی'' کا نظریہ پیدا ہوا ہے تاکہ انسان اور اس کے سیاق زندگی کے حالات کی بازگشت رومی حقوق کی طرف ہو جائے۔ یہ تحریک جو اپنے پیروؤں کے نزدیک بہت مختلف ہے اسے مشکل سے ہمہ گیر تحریک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی بازگشت عقل انسانی کی طرف ہوتی ہے لہٰذا اہمیت کی حامل ہے۔ اس تحریک نے بین الاقوامی حقوق کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

آج اس بات میں شک نہیں ہے کہ گروسیوس اور بین الاقوامی حقوق کے دوسرے ذمہ داران اپنے طریقۂ استدلال میں ''حقوق فطرت انسانی'' سے شدید متاثر تھے اور یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو خصوصیتیں ''عقل پرستی، اور انسان دوستی'' بین الاقوامی حقوق کی تشکیل میں یادگار رہ گئی ہیں۔ یہ دو خصوصیتیں جو کہ خود ''عظمت انسانی'' پر توجہ سے پیدا ہوئی ہیں، اس بات کا سبب ہوئی ہیں کہ بین الاقوامی حقوق سے گزرنے کے باوجود ایک پر پیچ وخم اور خطرناک راستہ سے گزر کر یقینی حقوق پر پہنچ جائے جو بین الاقوامی حقوق اور اسلام کے نظام حقوق میں مشترک نقطہ ہے اور یہ ''انسانی عظمت کے دفاع سے'' عبارت ہے۔

اسلام میں عظمت انسانی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان مخلوقات کے درمیان بہت سی جداگانہ خصوصیات کا حامل ہے اسی لیے اسے احسن التقویم کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ '' لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔'' (سورہ تین، ۴)

یقیناہم نے انسان کو احسن تقویم (یعنی وجود کی بہترین صورت) میں پیدا کیا ہے۔

قرآن خلقت انسانی کے آغاز اور اس کی فطری آفرینش کے سفر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان دنیا میں کس طرح آیا ہے اس کے بعد زمین وآسمان کی خلقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بیان فرماتا ہے: حقیقت یہ ہے کہ خدا کی گوناگوں مخلوقات کے درمیان یہ انسان ہے جو جداگانہ خصوصیات کا حامل ہے کہ جس نے تمام موجودات کے درمیان خلافت الٰہی کو حاصل کیا ہے۔ اگرچہ یہاں خلافت الٰہی پہلے انسان یعنی حضرت آدم کے لیے ثابت ہے، لیکن انہیں میں منحصر و محدود نہیں ہے بلکہ ان کے بعد والے انسانوں کو بھی یہ خلافت ملی ہے۔ اس الٰہی منصب کی عمومیت کے لیے دوسری آیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ خدا فرماتا ہے:

'' هُوَالَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ''

وہ وہی ہے جس نے تمہیں روئے زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔
البتہ آدم کی اولاد میں سے اس منصب پر وہی لوگ فائز ہوئے ہیں جو علم وایمان کے حامل تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے جیسے خدا کے انبیا، ائمہ دین، اولیائے خدا اور صالح بندے۔
خدا نے انسان کو خلافت الٰہی کے علاوہ دوسری عظمت وبزرگی اور شرافت بھی بخشی ہے اور اسے روئے زمین کی ساری مخلوقات پر تسلط دیا ہے۔
قرآن مجید کی نورانی آیتوں میں یہ معنیٰ بھی بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں، خداوند عالم کتاب آفرینش میں نسل انسانی کو بزرگی عطا کرنے کے بارے میں فرماتا ہے: ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ''اور یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو عظمت وبزرگی دی ہے۔
اس مقدمہ سے ایک منطقی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی عظمت میں مشترک محتویٰ کا وجود انسان کی حمایت کے لیے مخصوص نتائج کا سبب ہو سکتا ہے یہی مسئلہ اسلام کے حقوقی اسناد کے تجزیہ میں حقوق بشر کی حمایت میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

دوسری بات: اسلام میں حقوق بشر اور بین الاقوامی حقوق کے مواد کا مطالعہ

اس بات کے ضمن میں بشر کے خاص اسلامی حقوق کے اسناد کے مواد کی چھان بین کی جائے خصوصاً اس اعتبار سے کہ کس علاقہ میں اور کس حد تک تدوین پائے ہیں۔ (الف) پھر ہم بشر کے اسلامی حقوق اور بین الاقوامی حقوق کی تنظیم میں احتمال ٹکراؤ کی تحقیق کریں گے۔ (ب)

الف: بشر کے خاص اسلامی حقوق کے اسناد کے مواد کی تحقیق

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خاص ثقافتی دلیل سے گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی کے اواخر سے مسلمان معاشروں نے '' اسلامی حقوق بشر '' سے ارتباط رکھنے والے خاص اسناد کی تدوین شروع کی ان اسناد میں سے اہم ترین سند قاہرہ ہے یا اسلامی حقوق بشر کا اعلامیہ ہے جو کہ ۱۹۹۰ء میں تدوین ہوا ہے۔ اس اعلامیہ کے مقدمہ میں انسان کی عظمت وبزرگی کے لیے دینی اصولوں کو منظور کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعلامیہ میں آیا ہے:
ایس، او، آئی کے رکن ممالک اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ جو جہانوں کا پالنے والا، کائنات کو پیدا کرنے والا اور نعمتیں عطا کرنے والا ہے جس خدا نے انسان کو بہترین طریقہ سے پیدا کیا ہے اور اسے عظمت عطا کی ہے اور

روئے زمین پر اسے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اسی خدا نے زمین کی آبادی اور اصلاح کی ذمہ داری انسان کے دوش پر رکھی ہے اور خدائی ذمہ داری کی امانت کا بار اس کی گردن پر ڈالا ہے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے اسے انسان کے اختیار میں دے دیا ہے اور محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کے ساتھ کہ جن کو خدا نے ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا اور دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا، غلاموں کو آزاد کرانے والا اور طاغوتوں اور مستکبرین کو شکست دینے والا قرار دیا ہے، اس رسول کی رسالت کے اقرار ساتھ کہ جس نے تمام انسانوں کو برابر و مساوی قرار دیا ہے اور تقویٰ کے علاوہ کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں دی۔ لوگوں کے درمیان سے طبقہ بندی اور زور زبردستی کا خاتمہ کیا۔ ان لوگوں کے درمیان سے جن کو خدا نے ایک روح سے پیدا کیا ہے۔

توحید کے خاص عقیدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اسلام کی عمارت اسی کی بنیاد پر استوار ہے وہ عقیدہ جو انسان سے کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت مت کرو، کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو اور کسی کو اللہ کی جگہ خدا نہ بناؤ۔ وہ عقیدہ کہ جس نے بشر کی ذمہ دارانہ آزادی و حیثیت کی سیدھی سچی بنیاد قائم کی اور انسان کی آزادی کا اعلان کیا ہے۔

اسلام کی جاوداں شریعت میں آنے والے امور دین، جان، عقل، ناموس اور مال و نسل کی حفاظت اور دوسرے امتیازات جیسے تمام احکام و حالات کی جامعیت و میانہ روی کی تاکید کے ساتھ شریعت نے معنویات و مادیات کو باہم مخلوط کر دیا اور عقل و قلب کو ہم آہنگ بنا دیا اور حقوق و فرائض کے درمیان توازن قائم کر دیا ہے۔ فرد کے احترام اور عمومی مصلحت کے درمیان توافق اور طرفین کے درمیان عدل کے معیاروں کو برقرار کیا تاکہ نہ سرکشی رہے اور نہ کوئی نقصان ہو۔

امت اسلامیہ کے تمدنی اور تاریخی کردار کی تاکید کے ساتھ خدا نے اسے بہترین امت قرار دیا ہے تاکہ یہ امت بشریت کے سامنے ایک عالمی تمدن پیش کر سکے۔ ایسا تمدن جو دنیا کو آخرت سے جوڑ دے اور علم و ایمان کے درمیان ربط پیدا کر دے۔ لہٰذا آج ایسی امت سے توقع ہے کہ وہ متضاد رقابتوں میں مبتلا مسلکوں کے ماننے والوں کی ہدایت کرے گی اور مفلوج مادی تمدن کی مشکلوں کے لیے راہ حل پیش کرے گی۔

انسانی کوششوں میں جو کہ حقوق بشر سے مربوط ہیں اپنی ذمہ داری کو پورا کرے گی۔ ایسے حقوق کہ جن کی غرض ظلم و استحصال کے مقابلہ میں انسان کی مدد کرنا ہے اور شریفانہ زندگی میں آزادی اور اس کے حقوق پر زور دینا ہے جو شریعت اسلامی سے ہم آہنگ ہو۔

یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ جو بشریت مادی علم کی بلند ترین منازل طے کر چکی ہے وہ مستقل اور ہمیشہ اپنے تمدن کی حفاظت اور اپنے حقوق کی حمایت کے لیے ایک ایمانی مرکز کی محتاج رہی ہے۔

اس بات پر بھی ایمان ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق اور آزادیاں مسلمانوں کے دین کا ایک جزء ہے پس اصولی طور پر کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان خدائی احکام کو کلی یا جزئی طور پر موقوف کر دے یا انہیں ٹھکرا دے یا ان سے چشم پوشی کرے، جن کو خدا نے اپنی کتابوں کے ذریعہ نازل کیا ہے اور جن کے لیے خاتم الانبیاء کو بھیجا اور ان پر آسمانی رسالت کے سلسلہ کو ختم کیا ہے۔ اس بناء پر ان احکام پر عمل کرنا، عبادت ہے اور انھیں بجالانے میں کوتاہی کرنا یا ان سے آگے بڑھ جانا بری بات ہے۔ انفرادی طور پر ہر انسان ان کی حفاظت اور انہیں نافذ کرنے کا ضامن ہے اور ہم آہنگ توافقی طریقہ سے ساری امت کا یہی فریضہ ہے۔

اس مقدمہ کو مد نظر رکھتے ہوئے چند نکات پر غور فرمائیں:

۱۔ روایتی بین الاقوامی حقوق تاریخی لحاظ سے کلیسا کے مذہبی اشخاص کے مقابلہ میں بنائے گئے تھے اس کے برخلاف اسلامی مفکرین، صرف اسلامی تعلیمات کے اندر ہی حقوق بشر بنا سکتے ہیں۔ قاہرہ اعلامیہ کا متن بھی اسلامی فقہ کے پہلے سرچشمہ قرآن مجید سے لیا گیا ہے اس میں فلسفی افکار نہیں ہیں، وہ اسلامی اقدار و عظمت کو قرآن کے تناظر میں دیکھتا ہے۔[1]

۲۔ اسلام میں حقوق و تکالیف (ذمہ داریاں) ایک دوسرے کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصول کی بنیاد پر حق مسئولیت و ذمہ داری سے جدا ہو کر خود کو پیش نہیں کر سکتا لہٰذا یہ حقیقت ایک کلیدی نکتہ کے عنوان سے قاہرہ اعلامیہ مرتب کرنے والوں کے پیش نظر تھی۔[2]

۳۔ حقوق انسانی کی بنیادوں کا مسئلہ اجتماعی عدالت کے قالب میں بھی مد نظر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حقوق بشر مختلف نسلوں سے گزر کر آیا ہے اور آج تیسری نسل کا مسئلہ بلکہ بعد والی نسلیں بھی حقوق بشر میں شامل ہو گئی ہیں۔ قاہرہ اعلامیہ مرتب کرنے والے اس نکتہ کو بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اجتماعی عدالت کا

۱۔ محمد بن لطفی الصباغ، الانسان فی القرآن الکریم، المکتب الاسلامی، القاہرہ، ص ۱۴، ۱۹۹۲ء

۲۔ نصر فرید محمد واصل، آداب العلاقات الانسانیہ فی الاسلام: الحقوق والواجبات، المکتبہ التوفیقیہ للطبع والنشر، القاہرہ، ص ۳۴، ۱۹۹۹ء

مسئلہ انسانی حقوق کے مسائل میں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے چشم پوشی نہیں کی جانی چاہئے۔ اور اسلام میں یہی مسئلہ مد نظر تھااور آج بھی ہے۔[1]

اس بناپر قاہرہ اعلامیہ کے متن کو تین حصوں میں تقسیم کیاجاسکتا ہے۔ پہلے حصہ میں انسان کے فردی حقوق پر توجہ دی گئی ہے ان حقوق کی تشریح ان کے حصہ میں ہونے کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اور یہ حقوق بشر سے مشابہ اسناد میں کم نظر آتی ہے۔ دوسرے حصہ میں انسان و معاشرہ کا رابطہ اور اس کے انسانی حقوق کے آثار کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے اور آخر میں اسلامی ومذہبی اقدار کو اقدار ہی کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے کہ جس پر کوئی خدشہ وارد نہیں ہوسکتا۔

ممکن ہے اس تیسرے حصہ کو مغربی حقوق بشر سے ایک قسم کا تقابل کہا جائے۔ مغربی حقوق بشر میں انسان بذات خود اقدار کا حامل ہے اور یہ چیز دینی اقدار پر سوال اٹھا سکتی ہے حالانکہ اسلام میں جس نے انسان کو عظمت وبزرگی دی ہے وہ خدا ہے اور یہ بات فطری ہے کہ مغربی حقوق بشر خالق کائنات اور اس کے دین کے اقدار پر سوال نہیں اٹھاسکتا۔[2]

ا۔ قاہرہ کے اعلامیہ میں فردی حقوق اور عظمت انسانی

اس اعلامیہ کی پہلی دفعہ میں انسانی معاشرہ کے مضبوط واٹوٹ ارتباط کے مسئلہ پر توجہ دی گئی ہے۔ اس دفعہ میں آیا ہے کہ کلی طور پر سارے انسان ایک خاندان کے افراد ہیں، جنہیں خدا کی عبادت اور آدم کی اولاد کے باہمی رشتہ نے ایک جگہ جمع کردیا ہے انسانی شرافت، ذمہ داری اور جواب دہی میں سارے انسان برابر ہیں۔ نژاد و نسل، رنگ وزبان یا جنسی یا دینی اعتقاد، یاسیاسی وابستگی یا اجتماعی حیثیت وغیرہ کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

ا۔ برائے تبیین میانی عدالت اجتماعی در اسلام وارتباط آن باانسان بہ ویژہ بنگرید بہ:

Souad El Gazouani, Le concept de justice sociale dans l ' Islam, SN, 1985: Dina, Abdelkader, Social Justice in Islam, International Institute of Islamic Thought, 2000.

۲۔ المختار محمد التمسمانی، حد الردہ، من ثوابت الاحکام فی الاسلام، نقد مقال علمانی، الطبعہ الثانیہ، ناشرون، بیروت، لبنان، ص ۱۲۔ ۲۰۱۲ء

ضمنی طور پر صحیح عقیدہ انسان کے تکامل کی راہ سے اس کی شرافت میں اضافہ کی ضمانت لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری مخلوق خدا کی عیال کی مانند ہے اور ان میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اپنی نوع کے لیے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ اور کوئی کسی پر برتری نہیں رکھتا ہے۔ ہاں تقویٰ ونیک کام کے اعتبار سے برتری رکھتا ہے۔

اسی کے ساتھ اس کی دوسری دفعہ میں انسان کے سرچشمہ حیات کو بھی خدائی سرچشمہ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ''زندگی خدائی عطیہ ہے اور ایک حق ہے جو ہر انسان کو دیا گیا ہے اور تمام افراد اور ہر معاشرہ وحکومت پر واجب ہے کہ اس حق کی حمایت کریں اور اس حق کو بچانے میں پوری طاقت استعمال کریں اور شرعی قانون کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔''

اس بنیاد پر اسلام میں پھانسی دینا اگرچہ جائز ہے لیکن اس کی بنیاد و قوانین کی مکمل طور پر تشریح کی گئی ہے اور وہ محدود ہے اس اعلامیہ کی دوسری دفعہ میں بیان ہوا ہے کہ:

''۔۔۔ب) ایسی چیز کا استعمال ممنوع ہے جس سے انسان کے سرچشمہ حیات کو کلی یا جزئی طور پر نقصان پہنچتا ہو۔

(ج) جہاں تک خدا کی مشیئت ہے وہاں تک انسانی زندگی کو باقی رکھنے کی حمایت کرنا شرعی فریضہ ہے۔

(د) انسان کے جنازہ کا احترام کیا جائے، اس کی بے حرمتی کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح شرعی جواز کے بغیر اسے چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ اور اس سلسلہ میں حکومت پر واجب ہے کہ وہ حمایت ومدد کرے۔

یہی نکتہ جنگ کے اصولوں میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس اعلامیہ کی تیسری دفعہ میں آیا ہے:

''(الف) جنگ کی صورت میں طاقت یا اسلحہ کا استعمال ان لوگوں کے خلاف نہیں ہونا چاہئے جو جنگ میں شریک نہیں ہوتے جیسے بوڑھے مرد وعورت اور بچوں کو نہیں قتل کرنا چاہئے۔ زخمی اور بیمار علاج کا حق رکھتا ہے اور قیدی روٹی، کپڑا اور مکان کا حق رکھتا ہے۔ مقتولین کو مثلہ کرنا منع ہے۔ قیدیوں کا تبادلہ ہونا چاہئے اور جنگ کی حالت میں جو خاندان ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ان کی ملاقات کرائی جائے۔

''(ب) بمباری یا میزائیلوں کے ذریعہ دشمن ملک کی عمارتوں اور اداروں کو برباد کرنا، دشمن کے درختوں کو کاٹنا، کھیتوں اور ڈیریوں کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے۔''

اسلامی نظریہ کی رو سے انسان کی عظمت مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

''چوتھی دفعہ'' ہر انسان کی ایک حرمت ہے وہ اپنی زندگی میں یا مرنے کے بعد اپنی شہرت کی حفاظت کا حق رکھتا ہے اور حکومت و معاشرہ کا فریضہ ہے کہ اس کے پیکر اور قبر کی حفاظت کرے۔''

اس اعلامیہ میں فردی حقوق کے بارے میں شادی میں آزادی کی بحث پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

پانچویں دفعہ۔'' (الف) خاندان کو معاشرہ کی عمارت کا ستون قرار دیا گیا ہے اور شادی خاندان سازی کی بنیاد ہے لہٰذا مرد و عورت کو شادی کرنے کا حق حاصل ہے اور نسل یا رنگ یا قومیت و شہریت کو بہانہ بنا کر ان سے یہ حق نہیں چھینا جاسکتا۔

(ب) معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ شادی کی رکاوٹوں کو ہٹائیں اور مرد و عورت کی مشکلوں کو حل کریں اور خاندان کی مدد کریں۔

چھٹی دفعہ میں اہم مسئلہ مرد و عورت کے برابر ہونے پر بھی توجہ دی گئی ہے اور ساتویں دفعہ میں بچوں کے حقوق کو بیان کیا گیا ہے۔

چھٹی دفعہ: (الف) انسانی حیثیت میں، عورت مرد کے برابر ہے۔ عورت کے اتنے ہی حقوق ہیں جتنی اس کی ذمہ داری ہے وہ شہری شخصیت کی مالک ہے اور مالی امور میں خود مختار ہے وہ اپنے نام و نسبت کا تحفظ کر سکتی ہے۔

(ب) خاندان کے اخراجات اور اس کی دیکھ بھال کا ذمہ دار مرد ہے۔

ساتویں دفعہ: (الف) پیدائش کے وقت سے ہی ہر بچہ کا اپنے والدین، معاشرہ اور حکومت پر ایک حق ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں اس کی حفاظت و تربیت کریں اور اس کی مادی و تندرستی اور ادبی ضرورتوں کو پورا کریں۔ اس ضمن میں حمل اور ماں کی حفاظت کی جائے اور ان کا خاص خیال رکھا جائے۔

(ب) باپ اور وہ لوگ جو شرع کے قانون کے لحاظ سے باپ کی مانند ہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص قسم کی تربیت کے انتخاب کا حق چاہتے ہیں تو انہیں اخلاقی اقدار اور اسلامی احکام کے پرتو میں بچوں کے فائدے اور ان کے مستقبل کا خیال رکھتے ہوئے یہ حق دیا جائے۔

(ج) احکام شرع کے مطابق بچوں پر والدین اور اقوام پر اپنی قوموں کا حق ہے۔

اسلامی حقوق بشر کے اس دائرہ میں تعلیم وتربیت کے ذریعہ افراد کی شخصیت کی بالیدگی پر بھی توجہ دی گئی ہے اور ان کے لیے ایک خاص مواد مخصوص کیا گیا ہے۔

آٹھویں دفعہ، ہر انسان پابند ہونے اور پابند کرنے کے اعتبار سے ایک شرعی شخصیت کا حامل ہے اگر یہ شخصیت ختم ہو جائے یا مجروح ہو جائے تو اس کی جگہ اقدار آجائیں گے۔

نویں دفعہ: (الف) علم حاصل کرنا ایک فریضہ ہے اور تعلیم دینا معاشرہ اور حکومت پر واجب ہے۔ اور حکومت پر لازم ہے کہ تعلیم کے راستے اور اس کے اسباب فراہم کرے اور تعلیم میں اس طرح تنوع پیدا کرے کہ جس سے معاشرہ کو فائدہ پہنچے اور حکومت انسان کو اتنا موقع دے کہ جس میں وہ دین اسلام اور ہستی کے حقائق کی معرفت حاصل کرسکے اور اسے بشریت کی فلاح وبہبود میں استعمال کرے۔

(ب) ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ خاندان ومدرسے اور یونیورسٹی سے لے کر تبلیغاتی اور دوسرے ایسے ادارے کھولے کہ جو انسان کی دینی اور دنیوی تربیت کے میدان میں کام وکوشش کریں اور اس کی کامل ومتوازن تربیت کے لیے سعی کریں اور اس کی شخصیت کی اس طرح پرورش وتربیت کریں کہ جس سے خدا پر اس کا ایمان استوار اور حقوق وفرائض کے لیے احترام کی حمایت ہوسکے۔

دسویں دفعہ: اسلام دین فطرت ہے، انسان پر کسی بھی قسم کی زبردستی کرنا یا اس کے دین کے بدلنے کے لیے اس کی مفلسی یا جہالت سے فائدہ اٹھانا یا اسے بے دین بنانا جائز نہیں ہے۔

گیارہویں دفعہ۔ (الف) ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے غلام بنائے یا ذلیل کرے۔ یا مجبور ومغلوب کرے یا اس سے غلط فائدہ اٹھائے یا اسے بندہ بنائے۔

(ب) استعمار کی ساری قسمیں حرام ہیں کیونکہ یہ غلامی کی بدترین قسم ہے۔ جو قومیں استعمار کے شکنجے میں ہیں انہیں اس سے آزاد ہونے اور اپنی قسمت بنانے کا حق حاصل ہے۔ تمام ممالک ومذاہب کا فریضہ ہے کہ وہ ہر استعمار کی نابودی کے لیے کی جانے والی جنگ میں ان کی مدد کریں۔ تمام قوموں کو اپنی شخصیت کی حفاظت کرنے اور اپنے قدرتی ذخائر پر قابض رہنے کا حق ہے۔

بارہویں دفعہ: شریعت کے مطابق ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے رہنے کے لیے اندرون ملک یا بیرون ملک جس جگہ کا چاہے انتخاب کرے اور جہاں چاہے منتقل ہو جائے اور اگر کسی جگہ اس پر ظلم ہو رہا ہے تو کسی دوسرے ملک میں پناہ لے لے۔ اور پناہ دینے والے ملک پر واجب ہے کہ وہ اس وقت تک اس کی دیکھ ریکھ اور سرپرستی کرے جب تک اسے دوسری پناہ گاہ نہیں مل جاتی ہاں اس نے کسی ایسے کام کی وجہ سے پناہ نہ لی ہو جو شریعت کی نظر میں حرام ہو۔

۲۔ قاہرہ کے اعلامیہ میں اجتماعی حقوق

قاہرہ کے اعلامیہ کی تیرہویں دفعہ، افراد کے اجتماعی حقوق کے ایک پہلو کو واضح طور پر بیان کرتی ہے اور وہ ہے کام۔

کام ایک حق ہے حکومت اور معاشرہ کو چاہئے کہ وہ اس شخص کو کام دے جو کام کرنے پر قادر ہے۔ ہر انسان اپنے شایان شان ایسے کام کے انتخاب کا حق رکھتا ہے کہ جس سے اسے اور سماج کو فائدہ پہنچے۔ ہر کام کرنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امن وسکون اور دیگر اجتماعی ضروریات سے مالا مال ہو۔ ہاں اسے اپنے ذمہ ایسا کام نہیں لینا چاہئے جس کی اس کے اندر طاقت وصلاحیت نہیں ہے۔ یا اسے کسی کام پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہئے مرد وعورت میں سے ہر کام کرنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کام کے عوض جو عادلانہ اجرت معین ہوئی ہے کام کے بعد جلد وصول کرے اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ چھٹیوں اور انعامات سے استفادہ کرے۔ اسی کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ اپنے کام کو خلوص کے ساتھ صحیح طریقہ سے انجام دے اور اگر کام کرنے والوں کا ٹھیکیدار سے اختلاف ہو جائے تو حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس اختلاف کے حل کرنے اور ظلم کو ختم کرنے اور کسی کے بھی حق سے چشم پوشی کئے بغیر اس معاملہ میں مداخلت کرے۔

چودہویں دفعہ: (الف) انسان جائز طریقہ سے تجارت کرنے کا حق رکھتا ہے، ذخیرہ اندوزی کا حق نہیں رکھتا، نہ نقصان اٹھائے نہ کسی کو ضرر پہنچائے کسی کو فریب دینا اور سود لینا سخت منع ہے۔

پندرہویں دفعہ: (الف) ہر انسان شرعی طریقوں سے کسی چیز کے مالک بننے کا حق رکھتا ہے اور وہ مالک ہونے کے حقوق سے اس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ نہ خود نقصان اٹھائے نہ دوسروں کو ضرر پہنچائے اور نہ ہی اس میں معاشرہ کا خسارہ ہو۔ وہ دوسرے سے مالکیت کا حق نہیں چھین سکتا۔ ہاں عمومی منافع کے پیش نظر نقد وعادلانہ جرمانہ ادا کرنے کی صورت میں ایسا کر سکتا ہے۔

غیر اموال کا مصادرہ کرنا اور انہیں ضبط کرنا منع ہے مگر یہ کہ شریعت کے مطابق ضبط کرے۔

سولہویں دفعہ: ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے علمی یا ادبی یا ہنری شاہکار و تخلیق سے فائدہ اٹھائے اور اس کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے ادبی ومالی منافع وانعام کی حفاظت کرے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ تخلیقی اثر احکام شریعت کے خلاف نہ ہو۔

سترہویں دفعہ: (الف) انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفاسد اور اخلاقی بیماریوں سے پاک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرے کہ جہاں وہ معنوی لحاظ سے اپنی تعمیر کر سکے۔ حکومت ومعاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اسے اس حق سے محروم نہ رکھے۔

(ب) معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق عمومی ادارے بنا کر ہر انسان کے لیے طبّی واجتماعی سہولتیں فراہم کرے۔

(ج) حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر انسان کو یہ حق دے کہ وہ شریفانہ زندگی میں اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج جیسے بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

اٹھارہویں دفعہ: (الف) ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جان، دین، خاندان، ناموس اور مال کی طرف سے بے خوف زندگی گزارے۔

(ب) ہر انسان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے امور میں مکان، خاندان، مال اور باہمی ارتباط میں خود مختار ہو۔ اس کی جاسوسی اور نگرانی کرکے اس کی شخصیت کو مجروح کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے ان امور میں کوئی مداخلت کرتا ہے تو اس کی حمایت کی جائے۔

(ج) ہر انسان کی جائے سکونت کا بہر حال احترام ضروری ہے اہل خانہ کی اجازت کے بغیر یا ناجائز طریقہ سے کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔اسے منہدم یا ضبط کرنا یا اس کے رہنے والوں کو باہر نکالنا صحیح نہیں ہے۔

انیسویں دفعہ : (الف) شرعی امور کے تناظر میں سارے انسان برابر ہیں۔حاکم و محکوم بھی مساوی ہیں۔

(ب) عدالت سے مدد و پناہ لینا ایسا حق ہے جو سب کو دیا گیا ہے۔

(ج) ہر شخص ذمہ دار اور ہر شخص جوابدہ ہے۔

(د) جرم کی سزا حکم شریعت کے مطابق ہی ہوگی۔

(ہ) متہم (تہمت زدہ) بے گناہ ہے مگر دفاع کے سارے اسباب کے باوجود عادلانہ مقدمہ میں اس کا جرم ثابت ہو جائے۔

بیسویں دفعہ : کسی کو گرفتار کرنا، یا آزادی کو محدود کرنا یا جلاوطن کرنا یا سزا دینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ شریعت کی رو سے وہ ان میں سے کسی سزا کا مستحق ہو۔اس صورت میں بھی اسے بدنی و روحی شکنجہ نہیں دیا جاسکتا۔یا اس کے ساتھ تحقیر آمیز یا انسانی اقدار کے منافی سخت سلوک نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح کسی بھی شخص کا طبّی یا علمی امتحان لینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ خود چاہے۔نیز اس امتحان سے اس کی زندگی اور صحت کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ایسے استثنائی قوانین بنانا بھی جائز نہیں ہے جو مجریہ (یعنی حکومت) کو ایسا کام کرنے کی اجازت دیتے ہوں۔

اکیسویں دفعہ : اغوا کی ہر صورت ممنوع ہے چاہے کسی بھی مقصد کے لیے ہو۔

بائیسویں دفعہ : (الف) ہر انسان اپنا نظریہ بیان کرنے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ وہ شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

(ب) ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت اسلامی کے ضابطوں کے مطابق بری باتوں سے روکے اور نیک کاموں کی طرف دعوت دے۔

(ج) تبلیغات، معاشرہ کی زندگی کی ایک ضرورت ہے لیکن اس سے غلط فائدہ اٹھانا اس کا بے جا استعمال کرنا مقدسات اور انبیاء کی عظمت پر حملہ کرنا یا ایسا کام کرنا جس سے معاشرہ کے اقدار و اتحاد کو ٹھیس پہنچے یا اعتقاد پر ضرب لگے، منع ہے۔

(د) قومی یا مذہبی جذبات کو بھڑکانا یا ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے کہ جس سے نسل پرستی اور نژادی فکر برانگیختہ ہو۔

۳۔ قاہرہ کے اعلامیہ میں عمومی حقوق

قاہرہ کے اعلامیہ میں ۲۳ویں دفعہ اور اس کے بعد والی دفعات میں عمومی حقوق کے مسائل پر توجہ دی گئی ہے۔ اس دائرہ میں حیثیتی عنوان کے تحت ولایت کو بھی رکھا گیا ہے کہ ولایت ایک امانت ہے جس سے غلط فائدہ اٹھانا سخت منع ہے اور اس میں استبداد و من مانی سے کام لینا جائز نہیں ہے کیونکہ بنیادی حقوق کی تکمیل اسی راہ سے ہوتی ہے۔

(ب) ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک کے عمومی امور کے ادارے میں براہ راست یا بالواسطہ شریک ہو۔ نیز وہ احکام شریعت کے مطابق عمومی عہدوں کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے۔

اس ارتباط کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سند میں مذکور سارے حقوق اور آزادیوں کا شریعت اسلامی کے احکام کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

لہٰذا اس اعلامیہ کی ہر دفعہ کی تفسیر و وضاحت کے لیے فقط شریعت اسلامی سے رجوع کیا جائے گا۔

جیسا کہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ اس اعلامیہ کے بہت سے نکات، عالمی حقوق بشر کی دفعات کے مطابق ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود سوال یہ ہے کہ ان دونوں، اسلام کے حقوق بشر اور بین الاقوامی حقوق، کے درمیان کن موقعوں پر لاینحل تعارض ظاہر ہوتا ہے؟

(ب) اسلامی حقوق بشر اور بین الاقوامی حقوق کے محتویٰ میں تعارض کے مقامات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عظمت انسانی کی مشترک بنیادیں موجود ہیں جن میں تاریخی اعتبار سے اسلام اور یورپی (Humanism) میں انسان دوستی کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے ان دونوں نظاموں میں بہت سے مشترک

نقاط موجود ہیں کیونکہ اس کا اکثر حصہ قاہرہ کے ۱۹۹۰ء کے اعلامیہ میں موجود ہے۔ بین الاقوامی حقوق بشر کی ترتیب اور اسلام کے حقوق بشر میں اس تعارض کو تین اعتبار سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

ا۔ افراد کے خصوصی حقوق کے متعلق خاص ترتیب کے اعتبار سے جو خاص طور سے عورتوں اور بچوں کے بیرونی مظاہر کو شامل ہے۔

۲۔ خصوصی زندگی کے متعلق حقوق (Private Life/ vie Privee) کہ جس نے نظریہ کے اس بنیادی اختلاف کو ختم کر دیا جو اسلام کے دستورات وعادات اور یورپی نظریات کے درمیان تھا اور آج بھی (کسی حد تک) ہے۔

۳۔ اسلامی فقہ میں سزا کی ترتیب کا نظام جو علاقائی اور عالمی حقوق بشر اور فقہی دستورات کے نقطہ نگاہ کے قواعد کے درمیان تعارض کا سبب بنتا ہے یہ تعارض زنا، لواط، اور زمین پر فساد پھیلانے کی بعض سزاؤں کی نوعیت وکیفیت کے محدود ومعین دائرہ میں ظاہر ہوا ہے۔

ان تینوں کے بارے میں اسلامی حکومتوں کی توجہ اور سرگرمی مختلف رہی ہے۔ خصوصی حقوق کے دائرہ میں اکثر اسلامی عربی ممالک نے اس دائرہ میں تعارض کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۶ء میں تیونس، فرانس کے تسلط سے آزاد ہوا اور اسی سال طلاق کے (یک طرفہ) نظریہ اور چند ہمسری قانون کو خاندان کے قوانین سے حذف کر دیا اور ۱۹۹۳ء میں عورت کا مرد کے تابع ہونے والا قانون، خاندانی حقوق سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد والے برسوں میں الجزائر اور مراقش میں تیونس سے زیادہ تبدیلی ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں مراقش کے خاندان کے حقوق میں اور ۲۰۰۵ء میں الجزائر کے خاندان کے قانون میں خاندان کی آرائش میں بڑی تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس قانون میں عورت کا مرد کے تابع ہونے اور اس کی فرمانبرداری کو ختم کر دیا گیا اور مساوی شہریت اور ماں کی شہریت کا بچوں کو ملنا نازک وبحث انگیز موضوع بن گیا۔ تیونس میں ۲۰۰۱ء سے، مصر میں ۲۰۰۴ء سے اور مراقش میں ۲۰۰۷ء سے عورتیں اپنی شہریت اپنے ان بچوں کو دے سکتی ہیں جن کے باپ ان ممالک کی شہریت نہیں رکھتے۔[۱]

ا۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے گزشتہ دہائی میں اسلامی ممالک کے ذاتی قانون میں تبدیلیوں کے لیے ملاحظہ کریں:

ان تمام دشواریوں کے ساتھ تعارض کا حل دو دستوں (دوسرے اور تیسرے) دستہ سے مربوط ہے۔ دوسرے دستہ میں ثقافتی رکاوٹیں ہیں اور تیسرے دستہ میں حاکمیت کا وجود ایک ہم آہنگی تک پہنچنے میں مانع ہے۔ کلی طور پر جیسا کہ اسلامی حقوق بشر کے اعلامیہ میں مد نظر تھا، اور یہ کوشش کی گئی تھی کہ حقوق بشر سے مربوط ہر قاعدہ کی دلیل اور اس کی بنیاد بیان کر دی جائے اور خاص طور سے یہ چیز عمومی حقوق اور افراد کی سیاسی مشارکت کی بحث میں مرکز توجہ تھی اگرچہ اسلام میں ڈیموکریسی بذات خود ایک قدر کے اعتبار سے دستور کے عنوان سے نہیں تھی۔ لیکن اس اعلامیہ میں طریقہ استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں (ڈیموکریسی اور اسلام) میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ ہاں جو چیز اسلام کے خلاف ہے وہ حکومت میں سرکشی اور انسانوں کے حقوق سے چشم پوشی کرنا ہے یعنی وہ فردی واجتماعی حقوق جن کو تسلیم کرنا ہر انسان کے لیے حقوق کی بحث میں ثابت ہو چکا ہے۔

نتیجہ

آخر میں نتیجہ گیری کے عنوان سے یہ کہا جاسکتا ہے:

❖ اسلام میں دستورات کی ترتیب اور بین الاقوامی حقوق کے ایک دوسرے کے مشابہ ہونے میں تاریخی لحاظ سے نمایاں فرق ہے۔ کیونکہ اسلامی دستورات الٰہی اصولوں کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ آج کے بین الاقوامی قوانین دینی بنیاد کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان کے مادی حقائق کے پایوں (ستون) پر استوار ہیں اور انہیں پایوں کو اصل کے عنوان سے تسلیم کر لیا ہے۔

❖ بنیادوں میں فرق کے باوجود، تجزیہ و تحلیل میں بعض مشترک عناصر کا وجود ان دو حقوق کی تنظیم کی تقریب کا سبب ہوا ہے۔

❖ حقوق انسانی کے خاص اسناد کے متن کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور بین الاقوامی حقوق بشر کے نظریات ملتے جلتے ہیں۔

Ruiz Almodovar, El Derecho privado en los paises arabes. Codigos de Estatuto personal, Granada, EUG/Fundacion Euroarabe. 2005.

❖ان تمام باتوں کے باوجود ان دو تنظیموں کے بعض اداروں میں اس اضافی و نسبی اور کبھی مطلق تعارض و ٹکراؤ ناقابل انکار ہے یہ تین نقاط خصوصی حقوق میں تین جگہوں پر خصوصی و عمومی زندگی کی سرحدوں کی ترتیب اور اپنے کیفری سزاؤں کے نظام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

❖ گذشتہ دو دہائیوں میں اسلامی حکومتوں کی توجہ حقوق کے دائرہ میں ایک قسم کی نسبی واضافی مصلحت کی حکایت کرتی ہے۔اس کے باوجود سیاسی بحران اور مد مقابل کی ثقافتی دشواریوں کو سمجھنے خصوصاً آخری دہائی میں حقوق بشر کے بارے میں قواعد کی تنظیم کے درمیان تقابل میں اضافہ ہوا ہے۔

منابع وماخذ

الف۔فارسی و عربی منابع

پرویز ذوالعین، مبانی حقوق بین الملل عمومی، دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی، تہران، ۱۳۸۳۔

محمد عمارہ، معرکہ المصطحات بین الغرب والاسلام، نہضۃ مصر للطباعۃ والنشر والتوزیع،۱۹۸۸ء۔

محمد بن لطفی الصباغ، الإنسان فی القرآن الکریم، المکتب الاسلامی، القاہرہ، ۱۹۹۲.

نصر فرید محمد واصل، آداب العلاقات الانسانیہ فی الاسلام، الحقوق والواجبات، المکتبہ التوفیقیۃ للطبع والنشر، القاہرہ، ۱۹۹۹ء

۔المختار محمد التمسمانی، حد الردہ، من ثوابت الأحکام فی الاسلام، نقد مقال علمانی، الطبعہ الثانیہ، ناشرون، بیروت، لبنان، ۲۰۱۲

طرح اعلامیہ حقوق بشر و تعہدات بنیادین انسان در اسلام، تہیہ شدہ از سوی اتحادیہ جہان اسلام در سال ۱۹۷۹ء

طرح اعلامیہ جہانی اسلام، تہیہ شدہ از سوی شورای اسلامی لندن مورخ ۱۲آوریل ۱۹۸۰۔

اعلامیہ جہانی اسلامی حقوق بشر کہ توسط شورای اسلامی لندن تہیہ گردید ودر ۱۹سپتامبر ۱۹۸۱بہ یونسکو ارائہ گردید.

پس نویس سند راجع بہ حقوق بشر در اسلام کہ در جریان اجلاس سران سازمان کنفرانس اسلامی در ۱۹۸۱در طائف ارائہ گردید.

پیش نویس سند راجع بہ حقوق بشر کہ در پنجمین نشست حقوق بشر در دسمبر ۱۹۸۹ء در تہران، بہ تصویب رسید۔

پیش نویس اعلامیه حقوق بشر در اسلام که توسط وزرای خارجه اعضای سازمان کنفرانس اسلامی در اوت ۱۹۹۰ در قاهره تهیه گردید۔

پیش نویس منشور عربی حقوق بشر که توسط کشورهای عضو اتحادیه عرب در سال ۱۹۸۲، تهیه شد۔

طرح منشور حقوق بشر و مردم در جهان عرب که در دسامبر ۱۹۸۶ به تصویب رسید۔

کتاب سبز حقوق بشر در عهد جماهیری که در ۱۲ ژوئن ۱۹۸۸ توسط لیبی به تصویب رسید۔

ب- انگریزی منابع

- MOTILLA, A (ed.), Islam y Derechos Humanos, Madrid, Trotta, pp. 27-52.

Diego Panizza, Politica e Religione nell'opera di Alberico Gentili. in: Alberico Gentili nel quatro centenario della morte, Giuffre, 2008,

Giovanni Minnucci, Silete Theologi in munere alieno. Alberto Gentili tra diritto, teologia e religione, Monduzzi, 2016.

in; - Mireille Delmas-Marty, L'humanisme- juridique entre Mythe et Utopie, available http://www.tout-monde.com/sites/mireille-delmas-marty---127

Souad El Gazouani, Le concept de justice sociale dans l'Islam. SN, 1985; Dina, Abdelkader, Social Justice in Islam, International Institute of Islamic Thought, 2000.

Ruiz Almodovar, El Derecho privado en los países árabes. Códigos de Estatuto personal, Granada, EUG/Fundación Euroárabe. 2005.

بین الاقوامی علمی تعلقات کا فروغ اور اسلامی تمدن کا مستقبل

مؤلف: محمد حسینی مقدم

مترجم: مولانا سید حمید الحسن زیدی

خلاصہ

اسلامی تمدن کی پوری تاریخ میں اسلامی ممالک کی آپسی یکجہتی اور توسیع کے پیچھے بہت سے الگ الگ عوامل و اسباب کارفرما رہے ہیں اور یہ موضوع اسلامی تمدن کی تشکیل میں ایک اصلی اور بنیادی عامل قرار دیا گیا ہے جس کے لئے ایک طرف اسلامی ممالک کے درمیان علمی نقل وانتقال کی توسیع اور دوسری طرف اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان آپسی تعاون نے اسلامی تمدن کی علمی اور ذہنی نشو و نما اور اس کے نمایاں طور پر پھلنے پھولنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس مقالہ میں یہ کوشش کی گئی ہے مستقبل پر دور اندیشانہ نظر ڈالتے ہوئے آنے والے دور میں اسلامی تمدن کی مطلوبہ پیش رفت کے لئے اس موضوع کے تمام تاریخی مراحل پر توجہ دی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آئندہ بین الاقوامی سطح پر علمی نقل وانتقال کی توسیع کے دور میں اسلامی تمدن کی اس سے بہتر صورت حال کیا ہو سکتی ہے۔

اس مقالہ میں بنیادی طور پر جس دعویٰ کو پیش کیا گیا ہے وہ یہ کہ بین الاقوامی سطح پر مناسب علمی تعاون مختلف تقاضوں کے درمیان افہام و تفہیم کے راستے کھولے گا اور پھر اسلامی ممالک کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بہترین تعلقات کی فضا ہموار ہو گی۔اس طرح اسلامی ممالک کے درمیان آپسی تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر اچھا اثر پڑے گا جس کے نتیجہ میں اسلامی تمدن کی مطلوبہ کیفیت اور بہتر صورتحال کی تشکیل کے امکانات فراہم ہوں گے۔

اس مقالہ میں اختیار کئے گئے طریقہ تحریر میں وسیع تاریخی نقطہ نظر (macro historian) سے استفادہ کیا گیا ہے تاکہ وسیع پیمانے پر اس کے تاریخی مراحل کے بارے میں تحقیق کے ساتھ اسلامی ممالک کے درمیان باہمی معاملات میں علمی تعاون کے امکانات فراہم ہوں۔

اس سلسلہ میں تحقیق کا مقصد اور ان مراحل کا تجزیہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ موجودہ وقت میں اسلامی ممالک کے درمیان علمی تعاون اور مسائل کی کے نقل وانتقال کی کیفیت کا جائزہ لے کر مستقبل میں اس کی بدلی ہوئی تصویر اور اس کا اصلی نقشہ تیار کیا جاسکے اور یہ دیکھا جاسکے کہ مستقبل میں بین الاقوامی سطح پر اسلامی ممالک کے درمیان اسلامی تمدن کن مراحل سے دوچار ہو سکتا ہے

مذکوہ تحقیق اور مطالعہ سے حاصل ہونے والے اصلی نتائج کچھ اس طرح ہیں :

اسلامی ممالک کے درمیان بین الاقوامی سطح پر علمی تعاون کو بڑھاوا دینے اور ان میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے اس میں بہت سی خصوصیات کا پایا جانا ،اسلامی ممالک کے درمیان بین الاقوامی میدانوں میں تعاون کے سلسلے میں الگ الگ قسم کے متضاد افکار و نظریات، مغرب کی طرف رجحان اور صاحبان فکر و تحقیق اور اسلامی ممالک کے متخصص صاحبان فن کی نظر میں مغربی تہذیب اور شہری ثقافت کو افسانوی خواب قرار دینا۔

اسلامی ممالک کے درمیان علمی تعاون کی مشینری(hub) کو مضبوط بنانا تعلیمی ، تحقیقی اور فنی میدانوں میں تعاون کی راہ ہموار ہونے کے لئے اسلامی ممالک کے درمیان بین الاقوامی سطح پر قرار دادوں کا پاس کرانا۔

مقدمہ

اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے آغاز سے ہی مختلف نشیب و فراز سے دوچار رہی ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کا سنہرا دور، اس کی تعمیر و ترقی اور اس کی بربادی کے ادوار کو اس کے نشیب و فراز کے نمونے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

دنیا کے موجودہ دور میں اسلامی ممالک کے درمیان روابط میں حقیقت اور موقعیت پسندی کے پیش نظر پولیٹکل نقطہ نظر، اقتصادی حالات کے مطابق ہمیشہ بڑی طاقتوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔

بڑی طاقتوں کے حامل تمام ممالک اپنے بہتر مستقبل کے لئے اسلامی ممالک میں اپنی دخل اندازی بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

دین اسلام کی آمد نے ان تمام عرب قبائل کو جو خانہ بدوش اور صحرا نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے چوتھائی

صدی سے کم مدت میں معجزاتی طور پر توحید کے پرچم تلے متحد کر دیا۔

عرب کے علاقہ سے تمام باطل خداؤں اور دیگر ادیان ومذاہب کا اثر ختم ہو گیا اور عرب کے مختلف قبائل پرچم توحید کے سائے میں ایک پلیٹ فارم پر آگئے سرکش، ماجراجو، اور بکھرے ہوئے افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے اور اس طرح ایک جوش وخروش اور عزم و حوصلہ سے بھری ہوئی ایسی نا قابل شکست طاقت وجود میں آگئی جس نے مختصر سی مدت میں منظّم افواج کو پسپا کر دیا بڑے بڑے ملکوں تک رسائی حاصل کی اور نصف صدی بھی نہیں گذری تھی کہ ایک عالمی تہذیب و ثقافت کی بنیاد پڑ گئی اس طرح کہ اس زمانے کی دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اسلامی تہذیب و تمدن کی حکمرانی ہو گئی۔ (ابراہیم حسن، ۱۳۶۶: ۲)

اس تہذیب و ثقافت کے اس تیزی کی پھیلنے کی وجہ سے دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا اسنے اس زمانے کی قدیم دنیا کو تہہ و بالا کر دیا اور اس کے ویران کھنڈر پر ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھی جس کا سیاسی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی نظام اس پرانی دنیا سے بالکل الگ تھا۔

اسلامی تمدن کے وجود میں آنے سے مسلمان قدرت، طاقت و دولت اور علم و فکر کی تخلیق کے اعتبار سے عظیم مدارج پر فائز ہو گئے۔

مسلمانوں نے اس دور میں موجود مختلف ثقافتوں کے بہترین عناصر کو اپنے دامن میں جگہ دے کر علمی اور فکری میدانوں میں ایک نئے عظیم تمدن کو جنم دیا جس میں بقول فرہنگ رجائی کے کہ " ایک طرح کی اندرونی ہماہنگی اور نظم پائے جانے کے ساتھ ساتھ علاقائی خصوصیات اور عالمی شکل اختیار کرنے کا دعوے جیسے سارے عناصر پائے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ پوری دنیا پر چھا گیا اس عظیم اور منفرد شکل کے ذریعہ وسیع پیمانے پر اس دور کی تمام علمی اور فنی ایجادات کو اپنی مٹھی میں کر لیا اور اس طرح ایک بلا مقابلہ تسلط حاصل کرنے کی راہ میں اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب ایک عالمی تہذیب و ثقافت میں تبدیل ہو گئی"۔ رجائی، ۱۳۸۲: ۹۹۔۹۴۔

ساتویں صدی میں مغل افواج کے حملے کے بعد وسیع پیمانے پر شہروں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مراکز کی تباہی اور بربادی کے باوجود اسلامی تہذیب و ثقافت کو دسویں صدی میں دوبارہ زندہ ہونے کا موقع ملا اور اس بار اسلامی نقطہ نظر نے ماوراء النہر، ہندوستان، ایران اور عثمانی سلطنت کو ساتھ لے لیا اس طرح ایک بڑی صفوی سلطنت ایران میں، عثمانی سلطنت ترکی میں، گورگانی سلطنت ہندوستان میں قائم ہوئی ان میں سے ہر ایک نے

اسلام کے بارے میں اپنی سمجھ کی بنیاد پر دوبارہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو بین الاقوامی عظمت و سربلندی سے ہمکنار کیا اگرچہ یہ اسلامی ثقافت مغربی ٹکنالوجی کی تعمیر وترقی اور اس کے پوری دنیا پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے دوبارہ تنزلی کی راہ پر گامزن ہونے لگی اور آہستہ آہستہ اسے کنارہ کش کر دیا۔ حسین مقدم وضیع اجلالی، ۱۳۹۱۔

اس سلسلہ میں کوشش کی گئی ہے کہ مستقبل میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو اس کی مطلوبہ شکل تک پہنچانے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے ایک فیصلہ کن محرک کے طور پر اس کے بارے میں تحقیق اور جستجو کی جائے۔

اسی وجہ سے ہمارے مضمون کے اس حصہ میں مذکورہ تہذیب و ثقافت کو تشکیل دینے والے محرکات کو پہچانئے اور ان کی موضوع بندی کے مفہومی نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کو پہچاننے کے مفہومی نمونے

مذکورہ نکات کی روشنی میں آج کے زمانے میں اسلامی دنیا کے اندرونی اور بیرونی اسباب و عوامل اسلامی ممالک کی تشکیل کے حالات اور ان کی کیفیت اور اس کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر اور زیادہ واضح لفظوں میں کہا جائے تو اسلامی ممالک کے اندر کچھ اسباب و عوامل جیسے مرکزی حکومت کا اقتدار، ان ترقیاتی منصوبوں کی وسعت، عالمی اقتصاد میں اسلامی ممالک کی حصہ داری، اسلامی ممالک کا اپنے اندرونی مسائل و مشکلات پر کنٹرول، حکومت کے کاموں سے لوگوں کے راضی ہونے کی کیفیت اور مقدار، اسلامی ممالک کی علم و صنعت کے میدان میں ترقیاتی کاموں کی کیفیت اور حالات، اسی طرح اسلامی ممالک کے باہر کے اسباب و عوامل جیسے دیگر ممالک کے ساتھ ان کی سیاسی اور اقتصادی قرار دیں، اسلامی ممالک کی دیگر ممالک سے وابستگی یا عدم وابستگی کی مقدار اور اسلامی ممالک کا بین الاقوامی اور عالمی سطح پر الگ الگ مناسبتوں پر کیا اثر ہوتا ہے نیز اس کا اسلامی ممالک کے مستقبل کی تشکیل میں کیا کردار ہو سکتا ہے وغیرہ اور آخر کار یہ سوال کہ اسلامی ممالک کا کیا مستقبل ہوگا؟۔

تاریخی سماجیات کی نظر میں ایک ملک کے لوگوں کا دوسرے ملک کے لوگوں کے ساتھ لین دین، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر ان کے درمیان سیاسی، اقتصادی، حفاظتی روابط کے مضبوط ہونے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مختلف ممالک کے آپسی تعلقات میں جتنی زیادہ وسعت ہوتی رہتی ہے اور جتنے زیادہ سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی تعلقات بڑھتے رہتے ہیں اسی اعتبار سے ان کے سیاسی مستقبل اور ان سے متعلق دیگر امور کی تشکیل ہوتی ہے مثال کے طور پر اگر ایران اور سعودی عرب کے روابط مختلف میدانوں جیسے سیاست، اقتصاد، ثقافت وغیرہ میں اور زیادہ گہرے ہو جائیں تو ان کی حکومتیں بھی ان روابط کا پاس و لحاظ رکھنے کی پابند ہوں گی چاہے وہ اندر سے اس کی طرف مائل نہ بھی ہوں۔

اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایران کی یونیورسٹی سطح کے طالب علم سعودی عرب میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جائیں یا ایران کی یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے اپنے شعبہ کے اعتبار سے اپنے علمی مطالعہ اور مختصر مدتی یا طویل مدتی تعلیمی مراحل کے لیے سعودی عرب کا انتخاب کریں اور اسی طرح سعودی عرب کے اساتذہ وتلامذہ بھی اپنے اپنے عملی دائرہ کار کے اعتبار سے یہی رویہ اختیار کریں تو اس کا دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی کیفیت اور ان کی بہتری پر گہرا اثر پڑے گا اور ان کے موجودہ تعلقات میں بہتری پیدا ہوگی اس طرح ان دونوں ممالک کے درمیان مطلوبہ روابط کی کیفیت پیدا ہوگی۔

سر دست ایران اور سعودی عرب کے درمیان علمی سطح پر اس طرح کے روابط نہیں ہیں اور دونوں ممالک کے درمیان روابط کی موجودہ صورتحال کی اصلی وجہ اس طرح کے تعلقات کا نہ ہونا ہی ہے۔

ایران اور متحدہ عرب امارات کے درمیان تعلقات کی کیفیت ہمارے اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہے اگرچہ ایران اور متحدہ عرب امارات کے درمیان بھی کسی طرح کی یکجہتی اور یکسوئی نہیں پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں ممالک کے درمیان اقتصادی اور تجارتی روابط نے دونوں ممالک کے درمیان سخت کشاکشی کو لگام دے رکھی ہے اور اس طرح ان دونوں کے درمیان اقتصادی لین دین جاری ہے۔

مذکورہ نکات اور مثال کی روشنی میں اسلامی ممالک کے درمیان مستقبل میں کس طرح کے تعلقات ہوں گے اس کے لئے سیاسی، اقتصادی، سماجی، فنی، ماحولیاتی، عقیدتی اسباب و عوامل کے ساتھ ایک ماڈل یا نمونہ اس شکل نمبر ایک کے مطابق پیش کیا جاسکتا ہے۔

"شکل۔۱۔اسلامی تمدن کے مستقبل کی تشکیل کے محرکات کو تشخیص دینے کا ماڈل یا نمونہ

اس شکل کے مطابق ایک طرح سے بہت قریبی روابط جو مختلف اقتصادی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، فنی میدانوں میں اسلامی تمدن کی تشکیل میں مددگار ہوں گے لہٰذا اس طرز تفکر کی بنیاد پر اس بات پر غور کیا جائے گا کہ کس طرح اسلامی تمدن کی اس مطلوبہ صورت تک پہونچا جائے جہاں اسے کسی طرح کا الگ الگ ماحول اسے متاثر نہ کر سکے۔

اس تحریر میں ہماری کوشش ہوگی کی کہ ایک holistic نقطہ نظر سے الگ الگ ہر اس ماحول کا جایزہ لیں جو اسلامی تمدن کی تشکیل کی راہ میں کسی طرح کا کردار ادا کر سکتا ہے ہمارا یہ جایزہ یا یہ تحقیق اسلامی ممالک کے درمیان آپس میں علمی نقل وانتقال کی مقدار پر منحصر ہوگا۔

واضح طور پر یہ کہا جائے کہ ہماری کوشش ہوگی کہ بین الاقوامی ڈیٹا کلیکٹ کرنے والی کمپنیوں کی جانب سے دئے

گئے ڈیٹا کے مطابق environmental scanning کے مطابق تحقیق ہو اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ اسلامی سماج کے مختلف اعضاء کے درمیان کس طرح کے روابط ہیں اور ان روابط کا آپسی تعاون بڑھانے یا اسے کم کرنے پر کیا اثر پڑتا ہے؟۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم غیر یقینی امور کیا ہیں ان غیر یقینی امور کی روشن میں اسلامی تمدن کی بدلی ہوئی شکل کیا ہو گی ؟

اسلامی ممالک کا آپس میں علمی نقل وانتقال

اعلی سطح پر تعلیم کے سلسلہ میں بین الاقوامی فعالیتیں بہت حد تک معنوی اقدار کی بنیاد پر ہوتی ہیں البتہ ان اقدار کو معنوی اور مادی اقتدار کی صورت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح آپس میں مسابقاتی کیفیت پیدا ہو گی اور اقتصادی ترقی کا راستہ یونیورسٹیوں کی بین الاقوامی فعالیتوں کی بنیاد پر طے ہوگا اور پھر ثقافتی ڈپلومیسی کے ذریعہ تمام ممالک کے درمیان طویل مدت غیر مادی مفادات کی راہ ہموار ہو گی، اسلامی ثقافت کے سنہرے دور میں ان غیر مادی مفادات کے حصول کے لئے اسلامی مفکرین کی جانب سے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں سرزمینوں میں خاطر خواہ کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

تاریخی تنزلی کے بعد یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ اسلامی ثقافت کی صورتحال پر اس کا بالکل الٹا اثر پڑا ہے جبکہ غیر اسلامی ممالک اپنی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے اور اس کے نتیجے میں اپنے طویل مدت مادی اور غیر مادی مفادات کے حصول کے لئے کوشاں رہے ہیں خاص طور پر مغربی دنیا کے ثقافتی اور علمی معاشرے نے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں طرح کے ممالک میں اپنی پیٹھ مضبوط کرنے کی راہ میں ضروری قدم اٹھائے ہیں۔

مثال کے طور پر ایران میں مذہبی مبلغوں کی کارکردگی کے آغاز کے لئے جدید اسکول اور کالجز کی تشکیل کو دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کی معنوی اہمیت اور عظمت کا احساس اس وقت شروع ہوا جب اعلی سطح کے جدید تعلیمی نظام کی تشکیل وتدوین ہوئی۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے اسکول اور کالج ایسے شہروں میں بناتے تھے جہاں مذہبی اقلیتیں

زندگی بسر کرتی تھیں جس کی وجہ سے انہیں اپنی مذہبی تبلیغ اور نئے اسکول اور کالجز بنانے میں مدد ملتی تھی (صلاحی وبسناس ۸۲ ۱۳: ۹)۔

وہ لوگ دینی اقدار کی پاسبانی کرنے کے ساتھ ساتھ ایران میں اپنی پیٹھ مضبوط بنانے کے موضوع پر بھی خاطر خواہ توجہ دیتے تھے مثلاً ارومیہ نامی شہر جو عثمانی خلافت کے مرکز کے قریب تھا ان کے مذہبی مبلغین کے لئے عثمانی خلافت میں اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی راہ میں آسانی فراہم کر سکتا تھا۔

شہر تبریز ان بیرونی مبلغین کے لئے اسکول بنانے کا ایک دوسرا اہم مرکز تھا اس شہر کا انتخاب بھی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہاں سلطنت قاجار کے ولی عہد کی رہائش تھی جس کی وجہ سے حکمراں کی قربت حاصل ہو سکتی تھی اس شہر میں ان کی فعالیت ایران کے حکام کے دربار میں جگہ بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی تہران میں اسکول اور کالجز بنانے کی مہم بھی ہمارے اس دعوے کی تائید ہے اس لئے کہ شہر تہران دارالحکومت ہونے اور وہاں دیگر ممالک کی سفارتیں ہونے کی وجہ سے ان کے سیاسی مقاصد کے حصول کی راہ میں اہم کردار ادا کر سکتا تھا (صلاحی ۸۲ ۱۳ وہی حوالہ)۔

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر ممالک کی تہذیب و ثقافت میں اپنی جگہ بنانے کے لئے ایک اہم رکن ان کے علمی معاشرے میں نفوذ ہے یعنی اس مقصد کے حصول کی راہ علمی نقل وانتقال کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس طریقہ کار کے مطابق بیرونی طلباء اور محققین کو اپنی علمی فعالیت میں شامل کرنا ایک طرح سے ان کے نرم رویہ کی طرف اشارہ شمار کیا جاسکتا ہے۔

افکار وخیالات کے بدلنے اور اقدار و تعلیمات پر اثر انداز ہونے میں اس طرح کے نرم رویہ سے فائدہ اٹھانے کا خرچ بہت معمولی اور اس کے اثرات و نتائج بہت زیادہ، پائیدار اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ ایران میں بیرونی طلبہ کو داخلہ دینے کا مقصد بھی اسی طرح کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے اس طرح کی منصوبہ بندی کے مطابق یہ امید کی جاتی ہے کہ طلبہ ایران میں اپنی تعلیم کے دوران ایران کی اسلامی حکومت کی کامیابیوں اور اس کے علمی اور جدید ٹیکنالوجی سے مربوط ترقیاتی کاموں سے واقف ہونے کے ساتھ

اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی نمائندے اور سفیر کے طور پر کام کریں گے یہی وجہ ہے کہ بیرونی طلاب کو داخلہ دینے کی راہ میں ایران کی کوشش اور اس کا کوٹہ دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جیسا کہ پہلے وہ تعداد ذکر کی جا چکی ہے جس میں بتایا گیا کہ ۲۰۱۲ میں انگلینڈ نے ۱۲۷ جبکہ ایران نے نے ۱۴۶۰ طلباء کی تعلیم کے لئے پشت پناہی کی ہے۔

انگلینڈ کی حکومت ہر سال بیرونی طلبہ کی ایک بڑی تعداد کا اس مقصد سے اپنے یہاں اقتصادی پشت پناہی کے ساتھ داخلہ لیتی ہے کہ وہ لیڈر اور فیصلہ کن افراد کے طور پر اس کے نمائندے کی صورت میں اپنی فعالیت انجام دیں گے مثال کے طور پر اس نے ۲۰۱۲- ۲۰۱۳ء میں ۱۲۷ کامیاب طلبہ کو تعلیمی اخراجات فراہم کئے اس کے لئے اس نے ۱۷ ملین پاؤنڈ کا بجٹ مخصوص کیا جس میں سے ۳ ملین پاؤنڈ پرائیوٹ اداروں نے فراہم کیا۔ جن افراد کو یہ تعلیمی اخراجات فراہم ہوئے وہ دنیا کے گوشہ و کنار میں معزز افراد کے طور پر ایک منظّم تحریک چلانے میں کامیاب ہوئے جس کے ذریعہ ان ممالک میں انگلینڈ کے اثرات کو بڑھاوا دینے میں مدد ملے ان کی یہ ترکیب ان ممالک میں اس کی پیٹھ مضبوط کرنے کی راہ میں کارگر ثابت ہوئی۔

سرِ دست اس منظّم تحریک میں ۴۱ ہزار افراد شامل ہیں جو ۱۵۰ ممالک میں فعالیت کر رہے ہیں۔

Department for Business, Innovation & skills, 5312013

اس اعتبار سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اپنی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کے لئے بہت سے ممالک اس طرح کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں امریکہ کی منصوبہ بندی اور کوششیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں بنیادی طور پر امریکہ کی ڈپلومیسی کا اصل کام بقیہ ممالک کے ساتھ عالمی سطح پر علمی نقل و انتقال کو بڑھاوا دینا ہے خاص طور پر ترقی پذیر ممالک کے ساتھ۔

امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان پوری دنیا کے اسٹوڈنٹ میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے چاہے وہ آئیڈیالوجی کے اعتبار سے ان سے متفق نہ ہوں۔

جین نائٹ کی تحقیق کے مطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد بہت سے اسٹوڈنٹ کے لئے امریکہ کا سفر اور وہاں کا ویزا

حاصل کرنا مشکل ہو گیا خاص طور پر اسلامی ممالک کے افراد کے لئے۔

ایک نئی تحقیق جو انگلینڈ کی ثقافتی ایجنسیوں نے مسلمانوں کے ۵ ہزار طلبہ پر انجام دی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ترکی اور مصر و سعودی عرب وغیرہ کے اسٹوڈنٹ کے لئے امریکہ میں تعلیم حاصل کرنا ان کی سب سے پہلی پسند ہے (نائٹ ۱۳۷۸: ۱۱۳)۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی وزارت خارجہ نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کے باوجود ویزا دینے کی سیاست میں تبدیلی کی اور اس بات کی کوشش کی کہ بین الاقوامی سطح پر خاص طور پر اسلامی ممالک کے طلاب و محققین دوبارہ امریکہ آئیں اور اس سلسلے میں ان کی ممکنہ حمایت کی جائے (رنجبر ۱۳۸۹)۔

بین الاقوامی سطح پر علمی تبادل نظر اور نقل و انتقال کی ایک اور اہم معنوی اور غیر مادی وجہ علم و صنعت کے میدان میں جدید ترقیاتی نظریات تک پہنچنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۲ء سے ۲۰۱۰ء تک میڈیکل میں نوبل انعام حاصل کرنے والے ۶۵ فیصد افراد امریکہ کے باہر پیدا ہونے والے محققین تھے۔

اسی طرح فزکس کا نوبل انعام جیتنے والے ۵۵ افراد میں سے اٹھارہ افراد بھی امریکہ کے باہر کے تھے اور کیمسٹری کے ۳۷ افراد میں سے ۱۳ امریکہ کے باہر کے رہنے والے تھے (فتحی ۱۳۸۹: ۱۸)۔

غیر ایرانی طالبات کو داخلہ دینے اور ان کے اخراجات فراہم کرنے کے لئے اسکالرشپ اور دیگر ضروریات فراہم کرنے کے سلسلے میں کچھ کلی معیار پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

جیسے قومی مفادات کی راہ میں ان ممالک کی اہمیت، پڑوس کا خیال، ژئوپلوٹیک اور اورژئو اسٹریٹیجیک کی بنیاد پر ایران کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات، اس کے علاوہ آئیڈیالوجی میں متفق ہونا جیسے اسلامی ہونا وغیرہ دوسرے ممالک کے طلبہ کو داخلہ دینے کے عمومی معیار رہے ہیں۔

گزشتہ دو عشروں میں غیر ایرانی طلاب کے داخلے کی گذشتہ اور موجودہ صورتحال کے بارے میں تحقیق کے کچھ اہم نکات سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک اہم نکتہ ان ممالک کا انتخاب ہے جن سے روابط مقصود ہوں مثال کے طور اس سلسلہ میں انجام پانے والی تحقیقات بیان کرتی ہیں کہ گزشتہ ایک صدی میں ایران کے سب سے زیادہ تعلقات اور آپسی تعاون، تمام اسلامی ممالک کے درمیان ترکی سے سب سے زیادہ رہے ہیں (دیدگاہ و ہمکاران ۱۳۹۰: ۹۹)۔

لیکن اس کے باوجود اسکالرشپ کے ساتھ اس ملک کے طلبہ کو داخلہ دینے کی نسبت بہت کم ہے جبکہ ایران اور ترکی کے درمیان تاریخی اور ثقافتی روابط خاص طور پر علاقے میں ترکی کی اہمیت کے پیش نظر اس ملک کے طلبہ کے داخلہ کو سرفہرست ہونا چاہیے تھا۔

۱۳۷۰ ہجری شمسی سے اب تک صرف ایک سو چودہ اسٹوڈنٹ کو ہی اسکالرشپ فراہم ہوئی ہے یعنی ایرانی حکومت کی جانب سے صرف اتنے ہی طلبہ کو ان کے تمام اخراجات ادا کئے گئے ہیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد وہاں کی خارجہ پالیسی میں ترکی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی لیکن اس کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان علمی سطح پر گہرے تعلقات نہیں ہوسکے۔

۱۳۸۰ ھ ش سے اب تک سیریا کے چار سو پچیس اسٹوڈنٹ کا داخلہ لیکر ایران سورین طلاب کا داخلہ لینے کے اعتبار سے تیرہواں ملک رہا ہے۔

جبکہ سعودی عرب ۸۴۴۸ طلاب کو داخلہ دے کر پہلا ملک قرار پایا ہے؛ متحدہ عرب امارات، ترکی، جرمنی اور مصر دوسرے سے پانچویں نمبر پر رہے ہیں اس سلسلے میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ ترکی کی طرف سے آزاد تعلیم کے لئے سیریا کے مقابلے میں زیادہ درخواستیں ہیں۔

واضح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اپنے ہم سو ممالک میں سے ترکی، لبنان سوریہ، عراق کے ساتھ ساتھ روابط اور وہاں کے طلاب کو داخلہ دینے کے سلسلے میں ایک طویل مدت منصوبہ بندی کے مطابق کچھ نئے فیصلے لینے کی ضرورت

ہے شاید یہی وجہ ہے کہ سوریہ کے طلاب ایران میں آزاد تعلیم کو ترجیح نہیں دیتے اور اگر وہ ایران میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے بھی ہیں تو صرف اس موقعیت کی بنیاد پر جو انکے اپنے ملک نے ان کیلئے فراہم کی ہے۔

چنانچہ اگر یہ طے ہو کہ وہ تعلیم کا خرچہ خود برداشت کریں گے تو ممکن ہے کہ وہ ایران کے علاوہ دیگر ممالک میں تعلیم کو ترجیح دیں؛ ۲۰۱۷ء میں یونیسکو نے ایران میں طلاب کے داخلہ اور وہاں کے طلاب کو تعلیم کے لئے باہر بھیجنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نقشہ کی صورت میں یہ رپورٹ پیش کی ہے۔

نقشہ ا۔ ایران میں بیرونی ممالک کے طلاب کے داخلے اور ایرانی طلاب کو تعلیم کے لئے باہر بھیجنے کے حوالہ سے یونیسکو کی جانب سے پیش کیا گیا نقشہ

ممالک کے نام	تعلیم کیلئے بیرون ممالک بھیجے گئے طلاب کی تعداد	بیرون ممالک طلاب کے ایران میں داخلے کی تعداد
ایران	۵۱۳۹۵	۱۳۷۶۷
متحدہ امارات	۱۰۶۵۱	۷۳۴۴۵
جارڈن	۲۲۲۹۵	۴۰۳۸۷
ترکی	۴۵۸۲۰	۷۲۱۷۸
قطر	۵۰۱۰۷	۱۰۵۰۹
سعودی عرب	۸۶۴۸۶	۷۳۰۷۷
ملیشیاء	۶۴۴۸۰	۶۰۲۴۴
مصر	۲۸۷۱۹	۴۷۸۱۵

نقشہ نمبرا میں دئے گئے اعداد و شمار کے بارے میں میں تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ تقریبا ۳۲۰۰ غیر ایرانی اسٹوڈنٹ اسوقت ایران میں موجود ہیں اس سلسلے میں ایک اہم مسئلہ اسٹوڈنٹ کا باہر بھیجنا اور بیرونی طلبہ کو ملکی یونیورسٹیوں میں داخلہ دینے کی نسبت ہے۔

واضح لفظوں میں یہ کہا جائے کہ بیرونی طلاب کو داخلہ دینے یا اپنے طلاب کو باہر بھیجنے میں بڑے اور ترقی یافتہ ممالک کا نقطہ نظر انتہائی مثبت ہے اس طرح کہ وہ جتنے طلبہ کو داخلے کے لیے باہر بھیجتے ہیں اتنے بیرونی طلبہ کو اپنے یہاں یونورسٹیوں میں جگہ دیتے ہیں جبکہ اسلامی ممالک میں اس طرح کے روابط کی صورت حال منفی ہے۔

تمام عربی ممالک میں مصر کو ایک طویل مدت علمی خدمات کا تجربہ حاصل رہا ہے، اس ملک نے ۲۰۱۷ء میں ۲۶ ہزار طلاب کو تعلیم کے لئے باہر بھیجا جبکہ اسی دوران پانچ ہزار طلاب کو اپنے یہاں داخلہ دیا۔

ایران میں اس طرح سے داخلہ لینے اور باہر بھیجنے کی کیفیت منفی ہے یعنی ایران نے تقریبا ۵۱ ہزار افراد کو تعلیم کے لئے باہر بھیجا اور صرف ۱۴ ہزار طلاب کو اپنے یہاں داخلہ دیا ہے جبکہ ان میں بھی ایک بڑی تعداد ان طلبہ کی ہے جو پہلے سے ایران میں مقیم ہیں۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایران میں خود ایرانی طلاب کے مقابلے میں جن کی تعداد ۴۵ لاکھ افراد پر مشتمل ہے بیرونی طلاب کی تعداد متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، مصر، ترکی اور جارڈن میں بیرونی طلبہ کی بہ نسبت زیروکے برابر ہے جبکہ تحقیق کے مطابق یہ تعداد متحدہ عرب امارات میں ۳۹ فیصد ہے یعنی متحدہ عرب امارات میں تعلیم حاصل کرنے والے طلاب میں تقریبا ۳۹ فیصد بیرونی طلاب ہیں۔

متحدہ عرب امارات کے بعد دوسرا اور تیسرا درجہ قطر اور بحرین کا ہے جہاں کل طلاب میں سے قطر میں ۲۸ فیصد اور بحرین میں ۱۴ فیصد بیرونی طلاب ہیں (شفیع زادہ و پویا فر ۱۳۹۰-۱۲۶-۱۲۵)۔

بیرونی طلاب کے داخلے اور اپنے طلاب کو باہر بھیجنے کی نسبت کے علاوہ جن ممالک کے طلاب کو داخلہ دیا جارہا ہے ان ممالک کا متنوع (یعنی الگ الگ طرح کا) ہونا ہے مثال کے طور پر ترکی ۱۵۰ ممالک سے اور ایران صرف ۲۰ ممالک سے طلاب کو اپنے یہاں داخلہ دیتا ہے، ایران میں ۱۳۷۶۷ طلاب ہیں جن میں سے تقریبا ۸۲ فیصد یعنی ۱۱۳۱۳ صرف افغانستان ۱۱۹۴ عراق سے ۴۴۵ طلاب سیریا سے ہیں۔

۲۰۱۷ ء میں ترکی کے صرف ۳۰ طلاب کو داخلہ دیا گیا جو تمام بیرونی طلاب کا ۲/۰فیصد ہے جبکہ اسی سال ۵۳۰۲ایرانی طلاب ترکی میں تعلیم کے لئے مقیم ہیں یعنی ترکی میں بیرونی طلاب کا فیصد ۷.۵ (یونسکو۲۰۱۷)۔

بعض محققین کے مطابق مذکورہ تعداد کے چار بنیادی عناصر ہیں:

۱-سیاسی اعتقای اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہونا

۲_ جغرافیائی اعتبار سے قریب ہونا

۳-ایران میں بیرونی افراد کا قیام

۴۔ زبان کے اعتبار سے ایک ہونا جیسے دونوں ملکوں کا فارسی زبان ہونا (بزرگمہری ۱۳۸۵)۔

مختلف ممالک کے دانشوروں اور صاحبان علم و تحقیق کا ایک دوسرے سے جڑے رہنا علمی نقل و انتقال سے مربوط امور کا ایک اہم حصہ ہے جس سے الگ الگ افراد اور اداروں کو بہت سے مفادات حاصل ہوتے ہیں اس طرح کے آپسی تعاون کی راہ میں حکومتوں کی جانب سے امکانات فراہم کرنے کا ایک بڑا اثر ہوتا ہے جس سے علمی اور ادبی میدانوں میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں جورجیاکے دو محققین کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے انفرادی تجزیہ و تحلیل کی سطح میں یونیورسٹیوں سے جڑے ہوئے دانشوروں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے وہ نئے علمی نظریات سامنے لانے میں کافی موثر ثابت ہوتے ہیں۔

علمی دنیا میں جدید رجحانات کی راہ میں یونیورسٹیوں کے درمیان آپس کے تعاون کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لئے ان محققین نے کچھ معیار بنائے ہیں ان دونوں محققین کے مطابق بین الاقوامی سطح پر آپسی تعاون اور روابط، جدید نظریات کی پیدائش میں زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔

ان روابط میں اضافہ، جدید نظریات کے پیدا ہونے کی راہ میں تعداد اور کیفیت دونوں اعتبار سے بہتری لاتا ہے اسی طرح بہت سی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے افراد میں اجتماعی تعاون جدید نظریات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و ترقی پر بھی اثرانداز ہوتا ہے بین الاقوامی سطح پر تعلیمی نظریات کے فروغ

میں آپسی تعاون نے مختلف ممالک کے درمیان تعلیم کے میدان میں ایک دوسرے پر سبقت کی راہ ہموار کر دی ہے اس مہم کو پرکھنے کا ایک طریقہ کار ایک ساتھ مل کر تصنیف و تالیف کا کام انجام دینا ہے۔ یعنی کئی علاقوں کے لوگ مل کر کسی ایک ادارے سے اپنے نظریات کی کتاب شائع کر سکتے ہیں۔

نقشہ نمبر ۲ میں ایک ساتھ تالیف کے عمل کو تمام شائع ہونے والے نشریات کی بہ نسبت دکھایا گیا ہے ان شائع ہونے والے مقالات میں انجام پانے والی تحقیقات کے مطابق بین الاقوامی سطح پر آپسی تعاون کی بنیاد پر تیار ہونے والے مقالات ان کے حوالہ جات کی کثرت کے اعتبار سے اسی زمانے میں بغیر اپسی تعاون کے انجام پائے مقالات کی بہ نسبت زیادہ منظّم، ہماہنگ اور مستند ہیں۔

نقشہ ۲۔ منتخب ممالک کے باہمی تالیفات

ملک کا نام	تمام شائع شدہ مقالات کا فیصد
امریکہ	۵،۲۸
انگلینڈ	۴۴،۴
جرمنی	۴۴،۷
چین	۱۴،۷
جاپان	۲۳،۷
جنوبی کوریا	۲۵،۹
ہندوستان	۱۷،۵
برازیل	۲۴،۴
روس	۲۹،۴

بین الاقوامی تعاون کے بارے میں ایرانی محققین کے ذریعے انجام دی گئی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی محققین کا دیگر ممالک کے اپنے ہم منصب یا ہم پیشہ محققین کے ساتھ علمی تعاون کا رابطہ بہت سست اور کمزور ہے۔ (دیدگاہ و ہمکاران ۱۳۹۰-۹۶-۹۵)

اس سلسلے میں ایرانی اور غیر ایرانی محققین کے درمیان مشترک مقالہ سے متعلق ڈیٹا کے بارے میں تحقیق بھی قابل غور ہے۔

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد سے اسلامی ممالک کے ساتھ تعاون کے بارے میں ایرانی حکمرانوں اور سیاستدانوں کی بھرپور توجہ صرف آڈیالوجی کی بنیاد پر رہی ہے جس کا تذکرہ مدارک میں موجود ہے۔

اسلامی کانفرنس جو چار براعظموں کے ۵۷ ممالک پر مشتمل ہے اور جس کی کل آبادی تقریباً ایک ارب ۶ سو ملین ہے۔ اس اعتبار سے ایران کا دیگر ممالک کے ساتھ تعاون ان ممالک کے درمیان بہت سے مشترکہ امور کے پیش نظر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۴۰ء کے عشرے سے لے کر ۱۹۹۰ء تک صرف ۶۷۵ علمی مقالے ایرانی محققین اور ان کے غیر ملکی ہم منصبوں کے باہمی قلم کے ذریعے منظر عام پر آئے ہیں۔

جو مذکورہ مدت میں ایرانی محققین کی تحقیقات کا تقریباً ایک فیصد حصہ ہی ہے۔

مشترکہ علمی تخلیقات کی تعداد کے مطابق ۱۲ اسلامی ممالک جن کے ساتھ تعاون پر ایران نے خاص توجہ دی ہے ترکی اور ملیشیاء ہیں ان برسوں میں ۲۵۴ مقالے ترکی کے ساتھ اور ۲۰۴ ملیشیاء کے ساتھ مل کر شائع ہوئے ہیں۔

ترکی دانشوروں کے ساتھ سب سے زیادہ تعاون آئی حیاتیات اور بائیو کیمسٹری کے شعبے میں ہوا ہے۔

جبکہ کہ ملیشیاء کے ساتھ کیمسٹری کے شعبے میں سب سے زیادہ تعاون انجام پایا ہے۔ (دیدگاہ و ہمکاران ۱۳۹۰-۱۰۶-۱۰۰)

اس مدت میں ایران اور ان ممالک کے ساتھ اس طرح کے تعاون کی صورتحال اس دور میں ہوئی جب ایران کے لئے ان دونوں ممالک کے ساتھ تعلقات اولویت میں نہیں تھے۔

اس دوران ترکی اور ملیشیاء کے طلاب کا ایران کی یونیورسٹیوں میں داخلہ ہمارے اس دعوے کی دلیل ہے انقلاب اسلامی ایران کے بعد جب سے ملیشیاء کے طلاب کا داخلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے صرف ملیشیاء کے صرف ۵ طلاب کو ہی اسکالرشپ ملی ہے۔

ترکی کے طلاب نے بھی دیگر ممالک جیسے افغانستان سیریا لبنان فلسطین وغیرہ کی بہ نسبت بہت کم ہی اسکالرشپ اور دیگر اخراجات کے ساتھ ایران میں داخلہ لیا ہے۔

ایران کا علمی طبقہ وہاں کی اعلی سطحی تعلیمات پر حکم فرما نظریات کے برخلاف مغربی ممالک کے ساتھ تعاون میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے مثال کے طور پر ایران اور امریکہ کے درمیان علمی معاملات کی راہیں کچھ اسباب و عوامل کی بناء پر موانع سے دوچار ہیں۔

لیکن دونوں ممالک کے دانشوروں کا عزم وارادہ آپس میں علمی تحقیقات کی نشرواشاعت کو بڑھاوا دینا ہے۔

ابھی حال ہی میں امریکہ کی ایک قومی فاؤنڈیشن نے اعلان کیا ہے کہ ایران اور یورپ کے اٹھارہ ملکوں میں سے چودہ ملکوں کے درمیان مشترک مقالات میں نسبتا اضافہ ہوا ہے یورپین ممالک میں سے صرف ہالینڈ، انگلینڈ اور ناروے ہیں جنہوں نے ایران کے ساتھ تعاون میں کمی کی ہے۔

ایرانی دانشوروں کے درمیان مشترک مقالات میں سن ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ ء تک اضافہ ہوا ہے (jillson2013)۔

اسلامی ممالک کی آپس میں علمی نقل وانتقال اور اسی طرح غیر اسلامی ممالک کے ساتھ تعاون کی س کیفیت بھی ایران جیسی ہی ہے۔

ان کی میں باہمی تالیفات، ان کے طلاب کا دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کرنا، اور ان کے بین الاقوامی تعلیمی اور تحقیقی پروگرام اسلامی یا غیر اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ امریکہ، انگلینڈ، آسٹریلیا، فرانس اور جرمنی سے وابستہ ہیں۔

ان مشترکہ اور باہمی مقالات کے اثرات کی نسبت کا موضوع خود اس بات کا گواہ ہے جو اس طرح کے تعاون کے نتیجے میں منظر عام پر آئے ہیں مثال کے طور پر جو مقالات ایرانی اور غیر ایرانی محققین کی مشترکہ کاوشوں کے

نتیجہ میں شائع ہوئے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ان کی تاثیر دیگر مقالوں کی بہ نسبت زیادہ ہے بلکہ ان کا بین الاقوامی سطح پر چرچا بھی ہوا ہے۔

اس تاثیر کی نسبت کو عام طور پر ایک قابل استناد مورد کی طرف رجوع کئے جانے کی تعداد سے مربوط کیا جاتا ہے جیسے ایک وقت میں کسی ایک مقالہ، خط، نوٹ، خلاصہ کی طرف کتنے لوگوں نے رجوع کیا ہے۔

اس معیار کو رسالوں کے institute for seien tibie in formation کے مطابق مستند ہونے کی پرکھ کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر اس کی طرف سے ہر سال رسالوں کی طرف رجوع کرنے کے اعتبار سے ان کی میرٹ بنتی ہے اور پھر (Journd citation Reports) کی رپورٹ میں اسے شایع کیا جاتا ہے۔

نسبت کی یہ کیفیت نہ مقالہ کے اعتبار سے ہوتی ہے اور نہ لکھنے والے کے اعتبار طے کی جاتی ہے بلکہ ۳سال کے ایک پورے دورے کا حساب کیا جاتا ہے۔ مختلف ڈیٹا سینٹر جیسے Elsivaierاور Scopus ,isi

کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مقالات ایرانی دانشوروں نے اپنے مغربی ہم منصبوں کے ساتھ مل کر شائع کیغ ہیں وہ ان مقالات کی بنسبت جنہیں اسلامی ممالک نے شائع کیا ہے زیادہ مقبول ہیں اور ان کی تاثیر کی نسبت ذاہ بہت زیادہ ہے۔ ولایتی، نوروزی ۱۳۷۸،۔۷۰,۸۰

مختلف ممالک کے درمیان سیاسی روابط ان کے درمیان ان علمی تعاون پر ہی براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔

علمی پھرکھ رکھنے والے محققین کی تحقیق کے مطابق ایران اور عراق کے درمیان آٹھ سال کی لڑائی میں ایران اور اس کے پڑوسی ملکوں کے درمیان علمی تعاون بالکل ختم ہوگیا اس کے بعد اصلاح طلب پارٹیوں کے برسر اقتدار آنے اور سیاسی نظریات میں مناسب تبدیلی کی بناء پر علمی تعاون کی مقدار میں اضافہ ہوا اور اب مسلسل ہو رہا ہے روس، ترکی، ارمنستان کے ساتھ ایران کے سیاسی روابط نے ان ممالک کے درمیان علمی تعاون بحال کرنے اور اس کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ (مذکورہ حوالہ)

جدید ایجادات کو نوٹ کرنے کے لئے بین الاقوامی تعاون ن علمی نقل وانتقال کا ہی اہم حصہ ہے۔

شکل نمبر ا کے مطابق سن ۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۰ء تک ترکی میکسیکو روس برازیل اور چین نے بھی بہت ترقی حاصل کر لی ہے۔ (British Council 2012-27)

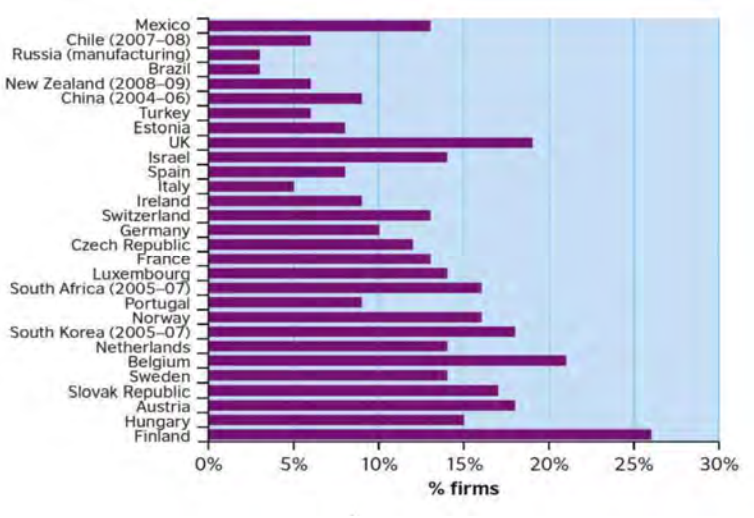

شکل ۲۔ عالمی اداروں کی بین الاقوامی ایجادات میں تعاون کی مقدار

اس شکل کے مطابق ترکی جیسے ملک میں تقریبا دس فیصد ایجادات بیرونی ہم منصبوں کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔

غیر یقینی کلیدی صورتحال کو سمجھنا

اس مقالے میں اسلامی تمدن کے مستقبل کی مختلف صورتوں کے بارے میں تحقیق کے مطابق اسکا موضوع سماجی اور ثقافتی محرکات کو قرار دیا گیا ہے اس مقالہ میں اسلامی ممالک کے آپسی تعاون پر اثرانداز اسباب و عوامل کے وسیع دائرہ کار اور اس سلسلے میں علمی نقل و انتقال کے کردار پر تاکید کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انجام پانے والی تحقیقات جو طلاب کے ردوبدل، تحقیقی اور تعلیمی پروگراموں کے اجراء نیز ان علمی مقالات کے بارے میں جو بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ان کی باہمی تالیف کے مطابق کی گئی ہیں ان کے نتیجے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے اسلامی تمدن کے مستقبل کے لئے اسلامی ممالک کے درمیان آپسی تعاون کی کیفیت مناسب صورتحال کی حامل نہیں ہے۔

اسلامی ممالک کا علم و صنعت کی راہ میں اصلی تعاون صرف غیر اسلامی اور مغربی ممالک کے ساتھ ہے، اس

موضوع کے اہم ترین غیر یقینی عناصر، اسلامی ممالک کی حکومتیں اور اسلامی ممالک میں تشکیل پانے والے علمی اجتماعات کا رجحان ہے۔

واضح لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب کی طرف رجحان رکھنا یا اسلامی حکومتوں کا مستقل ہونا ایک طرف سے اور اسلامی ممالک کے علمی طبقات کا مغربی ممالک کے ساتھ تعاون کو فروغ دینا دوسری طرف سے، ان ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی راہ میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک عام اسلامی سوچ اور اسلامی تمدن کی تشکیل کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔

اسی بنیاد پر اسلامی تمدن کے مستقبل میں بہتر شکل اختیار کرنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر علمی نقل وانتقال اور آپسی تعاون کے موضوع تحقیق کی گئی ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ غیر یقینی بیان، اسلامی ممالک کے درمیان ایک طریقہ کار تک رسائی کے بارے میں کئے جانے والے مطالعہ اور تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ (نگاہ کنید بہ صفوی ۱۳۷۸)

اسلامی تمدن کا متبادل مستقبل

دونوں شناختہ شدہ اصلی محرکات یعنی اسلامی حکومت اور وہاں کے علمی طبقات کے رجحان کے بارے میں تحقیق و جستجو کی بنیاد پر ان دونوں میں مندرجہ ذیل دو گانگی کو سمجھا جاسکتا ہے:

الف: ۱۔ موقوف حکومت ۲۔ مستقل حکومت: مستقل حکومت کی توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ حکومت، علمی طبقہ کے ساتھ تعاون کو بڑھاوا دینے کی راہ میں آسانیاں فراہم کرے جبکہ موقوف حکومت کی ساری توجہ اپنی آیڈیولوجیکل دلیلوں کی بنیاد پر صرف اپنے آرمانی مقاصد (utopia) پر رہتی ہے جنہیں وہ حکومت صرف اسلامی ممالک میں ہی نہیں بلکہ مغربی دنیا میں بھی پھیلانا چاہتی ہے۔

ب: روابط پسند علمی طبقہ اور غیر روابط پسند علمی طبقہ: روابط پسند علمی طبقہ کی ساری توجہ اس موضوع پر ہوتی ہے کہ ملک کے علمی طبقہ کے روابط باقی ممالک کے اپنے جیسے علمی طبقات کے ساتھ بڑھتے رہیں۔ جبکہ غیر روابط پسند علمی طبقہ ان علمی پروگراموں پر توجہ رکھتا ہے جو بقیہ مالک سے رابطہ بڑھانے کے قائل نہیں ہوتے بلکہ صرف علم وصنعت کی راہ میں ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ رابطہ بڑھانے پر تاکید کرتے ہیں۔

شکل نمبر ۳ میں دکھائے گئے مستقبل کے ۴ متبادل:

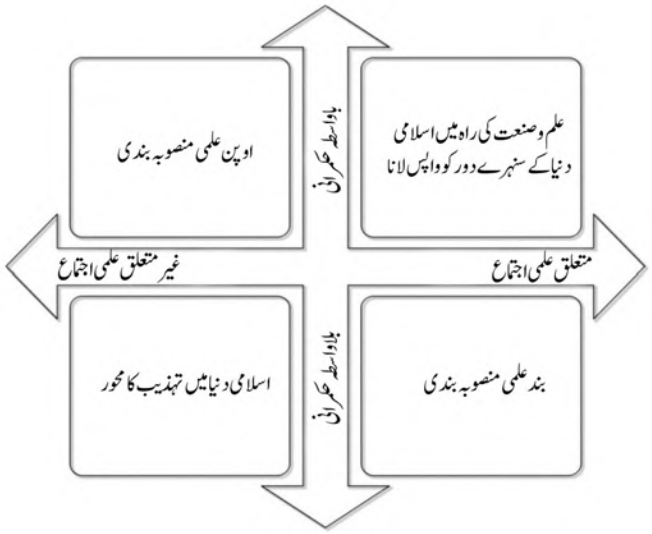

شکل ۳۔ اسلامی تمدن کے مستقبل میں متبادل

۱۔ علم وصنعت کی راہ میں اسلامی دنیا کے سنہرے دور کو واپس لانا

۲۔ اوپن علمی منصوبہ بندی

۳۔ بند علمی منصوبہ بندی

۴۔ اسلامی دنیا میں تہذیب کا محور

شکل نمبر ۳۔ اسلامی تمدن کے مستقبل میں متبادل

مذکورہ شکل کے مطابق اسلامی ممالک کے مستقبل میں بین الاقوامی علمی نقل و انتقال کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق تحقیق کی جاسکتی ہے:

الف۔ علم وصنعت کی راہ میں اسلامی دنیا کے سنہرے دور کو واپس لانا

یہ منظر نامہ منصوبہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ماضی کی اس صورتحال کی طرف واپس جایا جائے جس میں حکومتیں اور علمی طبقات دونوں علمی نقل انتقال اور آپسی تعاون کے قائل اور پابند ہوں۔

ب-اوپن علمی منصوبہ بندی

اس منظر نامہ یا منصوبے کی توجہ اس صورتحال پر ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک کی حکومتیں مستقل ہوں اور علمی نقل وانتقال کے روابط کی وسعت کے لئے اسباب فراہم کریں۔ جبکہ وہ علمی تحقیقات، اسلامی ممالک کے ساتھ رابطہ اور تعاون کے پابند نہیں ہوتے بلکہ اس کے مقابلے میں صرف علم وصنعت کی راہ میں ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ روابط بڑھانے پر تاکید کرتے ہیں۔

ج-بند علمی منصوبہ بندی

اس منظر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی طبقات، اسلامی ممالک کے ساتھ تعاون کو بڑھاوا دینے پر مائل تھے لیکن وہاں کی حکومتیں اپنی آڈیولوجی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر اس کی قائل نہیں تھیں بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی تھیں۔

نتیجہ

اسلامی ممالک کے درمیان یکساں سوچ کسی بھی مجبوری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان ایک دوسرے سے مشابہ خصوصیات اور ایک دوسرے سے جڑنے کے باہمی قصد وارادہ کے ساتھ حاصل ہوتی ہے یہ صورتحال اس طرح کی سوچ پر تاکید کرتی ہے جس میں جدوجہد کرنے والے یکساں سماج تک پہونچنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

اس میں مرحلہ در مرحلہ وہ وسائل وذرائع دخل انداز ہوتے ہیں جن سے مل کر یہ سماج تشکیل پاتا ہے اس طرح کے مراحل کو رضاکارانہ طور پر اتفاق کے ساتھ طے کیا جانا چاہئے۔ مختلف ممالک یکساں سوچ اور اتحاد کے ساتھ مشترکہ صورتحال اور آپسی اتفاق کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اتحاد کے سایہ میں وہ ممالک ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاتے ہیں اور آپس

میں صلح و دوستی کے ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ چونکہ ایک دوسرے پر بہت سرمایہ اور انرژی خرچ کرتے ہیں لہٰذا اہم مقاصد کو حاصل کرنے کی راہ میں قدم بڑھا کر کامیابی حاصل کر لیتے ہیں (حسینی مقدم و صنیع اجلال، ۱۳۹۱)۔

اسلامی ممالک کے درمیان یکسانیت، ایک دوسرے کو شریک قرار دینے نیز علمی تعلیمی، تحقیقی، معرفتی، فنی، جدید ٹیکنالوجی کے میدانوں میں حصہ داری کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اس کا اسلامی ممالک کی یکساں سوچ اور اسلامی تمدن کی مطلوبہ کیفیت تک پہنچنے میں اہم کردار ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے سیاسی فیصلے قومی اور بین الاقوامی سطح پر آپسی رابطہ کو نظر میں رکھ کر ہونا چاہیے۔ ان ممالک میں فعال تمام مربوط افراد کے درمیان روابط کس طرح سے تنظیم پائے ہیں اس کا آپسی تعاون کی صورتحال کے حصول پر بہت اثر ہوتا ہے۔ (صنیع اجلال، ۱۳۹۶)۔

اس سلسلے میں پیش کیے گئے تمام منظر ناموں پر نظر رکھتے ہوئے ان کے پورا ہونے یا نہ ہونے اور متبادل مستقبل اس طرح نظر میں رکھنا چاہئیے کہ تمام طرح کے مفادات حاصل کرنے والے افراد چاہے وہ قومی سطح کے نیچے ہوں یا قومی اور بین الاقوامی سطح کے سب پر نظر رکھ کر ایک نیا منظر نامہ تیار ہونا چاہیئے۔

اس کی پیش کش ہے کہ اس موضوع پر مستقبل میں مستقل تحقیق اور جستجو کو آگے بڑھانا چاہیئے۔

قدردانی

مقالہ نگار یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ محترمہ ڈاکٹر صنی اجلال اور جناب ڈاکٹر نجاتی حسینی کا شکریہ ادا کرے جنہوں نے اس مقالے کے لکھنے اور اسے بہتر بنانے میں مدد کی ہے۔

منابع

۱-ابراہیم، حسن، حسن، تاریخ سیاسی اسلام: از آغاز تا انقراض دولت اموی، ترجمہ ابوالقاسم پاینده، تہران، جاویدان، طبع ششم، ۱۳۶۶

۲-بزرگمہری، مجید، پذیرش دانشجوی خارجی در کشور: تجنبیات و راہکارہا (ملک میں بیرونی طلاب کے داخلے تجربات اور راستے)، تہران: فصلنامہ اطلاعات سیاسی، اقتصادی، ش ۲۳۳-۲۳۴، (۱۳۸۵) ص ۱۹۵-۱۸۸

۳- حسینی مقدم، محمد و صنیع اجلال، مریم؛ همگرایی جهان اسلام و آینده تمدن اسلامی، فصلنامه مطالعات سیاسی جهان اسلام، دوره ۱، شماره ۳، پاییز ۱۳۹۱، صفحه ۱-۱۹

۴- رجایی، فرهنگ؛ پدیده جهانی شدن؛ ترجمه عبدالحسین آذرنگ؛ تهران: نشر آگه؛ ۱۳۸۲

۵- صفوی، سید یحیی؛ وحدت جهان اسلام: چشم انداز آینده، تهران: نشر شکیب، ۱۳۸۷

۶- صلاحی، پرویز و بسناس، مهری، تاریخ مدارس خارجی در ایران، تهران: آوای نور، ۱۳۸۲

۷- صنیع اجلال، مریم؛ دیپلماسی علم و فناوری: راهبردی نو در توسعه کشورهای اسلامی، فصلنامه مطالعات سیاسی جهان اسلام، سال ۶، شماره ۲۳، پاییز ۱۳۹۶ صفحات ۱۹۳- ۲۱۵

۸- نائت، جین. «موافقتنامه های تجاری: پیامدهایی برای آموزش عالی»؛ مندرج در برتون، گیل ولامبرت، میشل؛ جهانی شدن و دانشگاه ها؛ ترجمه حمید جاودانی. تهران: پژوهشکده مطالعات فرهنگی و اجتماعی، ۱۳۸۷

۹- British Council. The shape of things to come: higher education global trends and emerging opportunities to 2020. 2017. Available at: http://www.britishcouncil.org/ihe/educationintelligence

۱۰- UNESCO, Global Flow of Tertiary-Level Students, 2017. Available at: http://www.uis.unesco.org/Education/Pages/international-student-flow-viz.aspx

۱۱- Department for Business, Innovation and Skills. International education strategy: global growth and prosperity. July 2013. Available at: www.gov.uk/bis

Advisory Board

Prof. S.M. Azizuddin Husain, Prof. Akhtarul Wasey
Prof. Syed Ali Mohd Naqvi, Prof. S.Tayyab Raza Naqvi

Editorial Board

Prof. Syed Akhtar Mahdi Rizvi, Dr. Haider Reza Zabit, Dr. Ali Reza Qazveh

Chief Editor

Dr. Mohd Ali Rabbani

Editor

Prof. Syeda Bilqis Fatema Husaini

Joint Editor

H.I.W. Maulana Syed Ghulam Husain Rizvi

ISSN : 2349-0950
Printed at: Alpha Art, Noida, U.P.

Iran Culture House
18 Tilak Marg, New Delhi-110001
Phone No: 23383232, 33, 34 Fax: 23387547
Email: ichdelhi@gmail.com, Website: newdelhi.icro.ir

RAH-E-ISLAM

An Urdu Quarterly Research Journal
of
Islamic and Cultural Studies

NO : 253

Special Issue on

Islamic Civilization

2022

Iran Culture House
18 Tilak Marg
New Delhi-110001